نام کتاب	مقصد بعثت
تقاریر	سید العلماء علامہ علی نقیؒ
تالیف	عابد عسکری فاضلِ قم
ترتیب نو	قلب علی سیال
کمپوزنگ	الحمد گرافکس لاہور (فضل عباس سیال)
ناشر	معراج کمپنی لاہور
تاریخ اشاعت	2014ء
طبع	اوّل
قیمت	

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

LG-3 بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔

فون: 0321-4971214/0423-7361214

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

مکرمی ومحترمی ______________ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''معراج کمپنی'' دینی کتب کی اشاعت کے حوالہ سے ایک جانا پہچانا ادارہ ہے۔ادارہ عرصہ دراز سے دینی کتب کی اشاعت میں اپنی خدمات انجام دے رہاہے۔ادارے کا مطمع نظر عوام تک بہتر اور سستے ترین انداز میں کتب کی ترسیل ہے۔اللہ تعالیٰ ادارہ ھذا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کیلئے بھرپور وسائل عطا فرمائے۔

زیرِ نظر کتاب ''مقصد بعثت'' سید العلماء علامہ علی نقیؒ کی تقریروں کا عظیم مجموعہ ہے۔ جسے مولانا عابد عسکری نے اپنے زورِ قلم سے مزید سنوارا ہے۔عام آدمی کیا سمجھ سکتا ہے کہ نبی کیا ہے اور انبیاء کیا سمجھ سکتے ہیں کہ خاتم الانبیاء کیا ہیں۔بس مکلف ہم اسی کے ہیں کہ اپنی کشتیِ ذہن کو ان کے کمالات کے سمندر میں ڈال دیں جتنی ظرف میں وسعت ہوگی، اتنا ہی وہ معرفت حاصل کرے گا۔ قارئین حضرات اس سے بھرپور استفادہ کریں۔

اُمید ہے آپ ادارہ ہذا کی اس کوشش کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور قرآن وعترت کی نصرت اور سید العلماء کی قدردانی کا حق ادا کرنے میں بھی کوشاں رہیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

معراج کمپنی لاہور

فہرست مضامین

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ اَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ الْمَعْصُوْمِيْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ فِيْ كِتَابِ الْمُبِيْنِ وَهُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۲﴾

پہلی مجلس

- اللہ تعالیٰ نے قرآن بنا کر رسولؐ پر بھیج دیا اب اس سے زیادہ عصمت کیا ہوگی کہ دل کی نیت ہو اور خدائی الفاظ ہوں۔
- مسلم کے معنی اپنے کو سپرد کردینے، سرجھکانے والا ایسا کہ جس کے ساتھ معصیت کا گزر ہو وہ اپنے کو سپرد کردینے والا جہاں خدا کے مقابلے میں اپنا اختیار صرف ہی نہ کیا جائے۔ میرے لئے خلیلؑ کی دعا کا سمجھنا آسان ہوگیا کہ لوحِ محفوظ میں ان کے یہی اوصاف تھے خالق کے دیئے ہوئے علم سے ان کو معلوم تھا کہ یہ رسول ان اوصاف کا مالک آنے والا ہے تو جو فیصلہ قدرت تھا اسی کو اپنی التجا بنا کر اپنی سعادت مندی کے لئے بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیا۔
- پوچھا جاتا ہے کہ چادرِ تطہیر کے نیچے کون تشریف فرما ہیں تو جواب آتا ہے کہ وہ فاطمہؑ ہیں، ان کے والد گرامیؐ ہیں ان کے سرتاجؑ اور انؑ کے دو بیٹے ہیں۔
- جس طرح حضرت خاتمؐ الانبیاء کی ضرورت تھی اسی طرح مریمؑ کے بعد فاطمہ زہراؑ کی ضرورت تھی۔

مقصدِ بعثت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ ٭ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۙ﴿۲﴾

وہ ہے جس نے اُمّیین میں ایک پیغمبر بھیجا انہی میں سے۔ جو ان کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ بناتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اٹھائیسویں پارہ میں سورۂ جمعہ کی آیت ہے جسے مؤمنین نمازِ جمعہ میں سنتے ہوں گے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ وہ ہے جس نے اُمّیین میں ایک پیغمبر بھیجا انہی میں سے۔ جو ان کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ بناتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

یہ مضمون موجودہ ترتیب کے لحاظ سے پہلے تین مقامات پر مذکور ہے۔ تھوڑا سا الفاظ کا فرق ہے۔ مضمون ایک ہے۔ سب سے پہلے، پہلے پارہ کے

آخری حصہ میں سورۂ بقرہ ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے خانۂ کعبہ کی دیواروں کو اونچا کرنے کا ذکر ہے۔ اس موقع کا مرقع جو قرآن مجید میں موجود ہے، وہاں ہے:

وَاِذۡ يَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَيۡتِ وَاِسۡمٰعِيۡلُ ؕ

''وہ موقع یاد رکھنے کا ہے جب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ خانۂ کعبہ کی بنیادوں کو اونچا کر رہے تھے''۔

ضمناً اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خانۂ کعبہ کی بنیاد پہلے سے موجود تھی۔ امتدادِ زمانہ سے اس کی دیواریں منہدم ہوگئی تھیں اور نشانات نمایاں نہیں تھے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ دونوں اس پر مامور ہوئے تو جس وقت وہ دیواروں کو بلند کر رہے تھے۔

عجیب اندازِ کلام ہے قدرت کا۔ ترجمہ میں عموماً یہ لکھا جاتا ہے کہ وہ کہہ رہے تھے مگر قرآن مجید میں مجھے ایسا کوئی لفظ نظر نہیں آیا جس سے ہم یہ سمجھیں کہ وہ کہہ رہے تھے۔ کہنے کیلئے عربی لفظ ہے قول۔ اگر قول کے ساتھ ماضی کا لفظ آتا ہوتو ''قَالَا''۔ ان دونوں نے اس وقت یہ کہا مضارع آتا تو یہ ہوتا ''يَقُوْلَانِ''۔ وہ دونوں یہ کہہ رہے تھے۔ عربی کے لحاظ سے ایک اور صورت تھی کہ حال کے طور پر اسم فاعل لایا جاتا تو ہوتا ''قَائِلِيْنَ''۔ اس حالت میں ان کا قول یہ تھا مگر نہ اس میں ''قَالَا'' ہے، نہ ''يَقُوْلُوْنَ'' ہے، نہ ''قَائِلِيْنُ'' ہے۔ ان میں سے کوئی لفظ بھی نہیں ہے۔

پس اگر وہ کہتے تو جو مقولہ ہوتا، وہ قرآن مجید نے شروع کر دیا۔

''رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا''۔''اے ہمارے مالک! اسے ہم سے قبول فرما''۔ یہ بیچ میں کہاں کہا کہ وہ کہہ رہے تھے۔ فارسی میں گفتند آتا ہے تو اس کیلئے کوئی لفظ نہیں۔ اُردو میں ''کہہ رہے تھے، کہتے ہیں''۔تو اس کیلئے کوئی لفظ قرآن مجید میں نہیں۔تو اس لئے یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ وہ یہ کہہ رہے تھے یا ان سے دل کی صدا تھی جسے قرآن نے اپنے لفظوں میں پیش کر دیا۔ مجھے آپ کی جانی پہچانی ہوئی آیتوں میں اور ان کی شانِ نزول میں اس کی نظیر ملتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سورۂ ھَلۡ اَتٰی میں جن ہستیوں سے اس واقعہ کا تعلق ہے، ان کا کردار پیش کیا۔

وَيُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسۡكِيۡنًا وَّيَتِيۡمًا وَّاَسِيۡرًا۝۸

وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت میں۔

اب مفسرین میں اختلاف ہے''عَلٰى حُبِّهٖ''۔اس کی محبت میں۔کوئی کہتا ہے کہ اس سے پہلے طعام کا ذکر ہے۔ اللہ کا تو نام بھی نہیں ہے۔ طعام کی محبت میں۔یعنی بھوکے ہیں خواہش طعام پھر بھی یہ دیتے ہیں۔ ارے صاحب! قرآن مجید سامنے ہے۔ آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ کس کی محبت میں؟ قرآن کو تو کافی سمجھتے ہیں۔تو کافی کہہ دینا آسان ہے اور فہمِ قرآن کے وقت کافی بنانا مشکل ہے۔

غرض، چاہے معنی کچھ بھی ہوں، فضیلت کا پہلو تو بہر حال ہے۔خواہ محبتِ الٰہی میں، خواہ خواہش طعام کے باوجود کھانا کھلاتے ہیں۔مسکین کو، یتیم کو اور اسیر کو۔یعنی جس ترتیب سے کھانا کھلایا تھا، اُسی ترتیب سے الفاظ بھی آئے ہیں۔ پہلے دن مسکین آیا تھا، دوسرے دن یتیم آیا تھا، تیسرے دن اسیر آیا تھا۔

اسی ترتیب سے یہاں الفاظ موجود ہیں۔ اس وقت مفصل بیان تو یہاں پیش نہیں کرنا تھا مگر خدا یہ کردار پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے:

"اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا"۔

پھر مجبوراً ترجمے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ یہ کہہ رہے تھے۔ قرآن میں کہاں ہے "کہہ رہے تھے"۔ اس میں تو ہے کہ انہوں نے کھانا کھلایا اور اس کے بعد ہم تم سے جزا چاہتے ہیں۔ نہ شکریہ۔ تو یہ لفظ کہاں سے آیا کہ وہ کہہ رہے تھے۔ اب وہاں تو بربنائے واقعہ میں سمجھتا ہوں کہ کہہ نہیں رہے تھے، اس لئے کہ "کُمْ" ہے۔ صیغہ جمع۔ وہی ترجمہ میں نے کیا کہ لوگوں کو بس اللہ کی خاطر کھلاتے ہیں، نہ تم سے جزا چاہتے ہیں نہ شکریہ۔ اُن سب سے یہ کہہ رہے ہیں۔ تو وہ سب ایک ساتھ کب آئے تھے کہ ان سے یہ کہا جاتا؟ وہاں تو ایک دن مسکین آیا، دوسرے دن یتیم آیا، تیسرے دن اسیر آیا تھا۔ وہ اجتماعی شکل میں کس دن آئے تھے جو ان سے یہ الفاظ کہے جاتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان سے نہیں کہا تھا۔ زبان سے کہنے میں وہ کردار کی بلندی بھی نہیں ہے۔ زبان سے نہیں کہا تھا۔ ہر دن جو دل کی آواز تھی، جو اس کی نیت تھی، اس نیت کو اس خالق نے جو عالم الغیب ہے، جو عالم الضمائر ہے، اُس نے قرآن بنا کر رسولؐ پر بھیج دیا۔ اب اس سے زیادہ وہ عصمت کیا ہوگی کہ دل کی نیت ہو اور خدا کے الفاظ ہوں۔

تو بس اب میں نے نظیر بھی قرآن سے پیش کر دی۔ یہی صورت وہاں ہے کہ ان کا ایک عمل درج کیا کہ وہ خانۂ کعبہ کی دیواروں کو اونچا کر رہے تھے۔

اب اس وقت ان کے دل کے جو جو بھی تصورات تھے، خالق نے مسلسل کئی آیتوں میں ان کا تذکرہ کر دیا اور دل کی بات کو سننے والا فقط وہی ہے۔ تو اس نے ان کے دل کی صدا کو یہ بیان کیا کہ:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط

''اے ہمارے مالک! اے ہمارے پروردگار! ہم سے اس عمل کو قبول فرما''۔

اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

''یقیناً تو سننے والا ہے اور جاننے والا ہے''۔

کیا کہنا بلاغتِ قرآنی کا کہ اس نے آیت کے آخر میں تتمہ جو رکھا، اس میں بھی دونوں رُخ ہیں۔ تو سننے والا ہے اور جاننے والا ہے۔ یعنی زبان سے کہا جائے گا تو تو سنے گا اور دل کی صدا ہو تو جان لے گا تو یہ سلسلہ شروع ہو رہا ہے واقعہ کا:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

اس کے بعد اسی سلسلہ میں:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ

''اے ہمارے مالک! ہمیں اپنی بارگاہ میں مسلم قرار دے''۔

اب اس عملِ خیر کی قبولیت کی دعا کے ساتھ اور اس کردار کی بلندی کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں جو دعا کر رہے تھے کہ ہمیں مسلم قرار دے۔ نبی ہوتے ہوئے، رسول ہوتے ہوئے۔ یہ دعا جو بارگاہِ الٰہی میں کر رہے ہیں، کیا ہم جیسے

مسلمان ہونے کی؟ جیسے ہم مسلمان ہیں؟ جیسا معیارِ نظر اونچا ہوتا ہے، ویسا ہی الفاظ کا معیار اونچا ہوتا ہے۔ ہم جب مسلمان کہتے ہیں کہ تو اس کا معیار یہ ہے جو سب جانتے ہیں اور جو خلیلِ حق کہہ رہے تھے، ہمیں اپنی بارگاہ میں مسلم قرار دے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلم کا وہ معیار ہے۔ مسلم کے معنی اپنے سپرد کر دینے والا، سر جھکانے والا۔ تو وہ سر جھکانے والا جس کے ساتھ معصیت کا گزر نہ ہو، وہ اپنے کو سپرد کرنے دینے والا، جہاں خدا کے مقابلہ میں اپنا اختیار صرف ہی نہ کیا جائے، یہ معیار مسلم کا جو ہے، اس کے دوسرے معنی ہیں معصوم ہونا۔ اور پھر عصمت کا وہ مرتبہ۔ نبوت اور رسالت کے بعد جس کی دعا کی جائے، اس کا مطلب یہ ہے یہ وہ درجہ ہے اطاعت کا جس کے ساتھ ترکِ اولیٰ کا بھی گزر نہ ہو۔

اب اس کے ساتھ الفاظ قرآنی بڑھتے ہیں۔ یہ کوئی حدیث نہیں ہے جس میں ضعیف وقوی کا سوال پیدا ہو۔ قرآن کی آیات ہیں کہ ہمیں اپنی بارگاہ میں مسلم قرار دے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً

اور ہماری نسل سے بھی ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو رکھنا جو تیری بارگاہِ میں مسلم ہو۔ جو لفظ مسلم اپنے لئے ہے وہی ان افراد کیلئے ہے جو ذریت میں سے ہوں۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ

''ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ رکھنا جو تیری بارگاہ میں مسلم ہو۔

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا

اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے ہماری آنکھوں کے سامنے سکھا دے۔

وَتُبۡ عَلَيۡنَا ۚ

''اور اپنی نظرِ توجہ ہماری طرف رکھنا''۔

اِنَّكَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۲۸﴾

''تو بڑی نظر رکھنے والا اور بڑا رحم وکرم شاملِ حال کرنے والا ہے''۔

اب اس سلسلہ میں ارشاد ہورہا ہے یعنی ابراہیمؑ کی زبانی عرض ہورہا ہے کہ:

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ

میں نے کہا تھا یہی مضمون تین جگہ ہے۔ اس میں سے پہلی جگہ یہ ہے۔ اس کے بعد تین جگہ ہے یعنی مجموعی طور پر چار جگہ ہے۔ تو ''رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ''۔ اے ہمارے مالک! ان میں بھیجنا ''رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ'' ایک رسول انہی میں سے۔ کن میں اور کن میں سے؟ اس سے قبل دنیا کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے قبل اس اُمتِ مسلمہ کا ذکر ہے۔ وہ گروہ جو اس معیار کا مسلم ہو۔ جیسے یہ خود ہیں۔ اس گروہ کا ذکر ہے اور کہا جارہا ہے انہی میں۔ انہی میں سے۔ تو ہمارے رسول سے پہلے اور ابراہیمؑ تک درمیان میں جتنے ہیں سب کو ماننا پڑے گا اس معیار کا مسلم!

وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ

ایک رسول بھیجنا انہی میں سے۔

آگے وہی مضمون ہے:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ

اب وہ تو اللہ سے کہہ رہے ہیں، اس لئے اضافت اس کی طرف واحد حاضر کے صیغے سے کہ جو تیری آیتوں کی تلاوت کرے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کو پاک وصاف کرے۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٢٩﴾

بے شک تو بڑا غلبہ والا، بڑی حکمت والا"۔

اب ایک پہلو پر غور کیجئے کہ سب سے پہلے یہ الفاظ جنابِ ابراہیمؑ کی زبان پر آئے، بصورتِ دعا۔ ہم عام طور پر دعا قبول ہونے کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ جو نتیجہ ہوا، وہ ہماری دعا سے ہوا۔ یہی معنی قبولیتِ دعا کے ہیں کہ ہم نے دعا کی، اللہ نے قبول کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دعا نہ کرتے تو یہ نہ ہوتا۔ اولاد کی دعا کی، دعا سے اولاد ہوئی۔ تو اگر نہ کرتے دعا تو نہ ہوتی۔ رزق کی وسعت دعا نہ کرتے تو اسی طرح سے تنگ دستی میں مبتلا رہتے۔ یہی معنی قبولتِ دعا کے ہمارے ذہن میں ہیں۔ اب غور فرمائیے کہ کیا یہاں یہ صورت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے گویا اپنے نفس سے یہ اوصاف تجویز کیے کہ ایک ایسا رسول آنا چاہئے اور بارگاہِ الٰہی میں اس کی دعا کی، التجا کی۔ خدا نے وہ دعا قبول کی۔ پھر انہی اوصاف کا رسول بھیجا جو اوصاف انہوں نے تجویز کئے تھے۔ اب اس رسول کے ہر جگہ وہ اوصاف آ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ تین جگہ اور یہ تو پہلی جگہ ہے۔ وہی اوصاف حضرت ابراہیمؑ نے گویا تصنیف کیے۔ انہوں نے تجویز کئے کہ ان

اوصاف والا رسول ہونا چاہئے اور بارگاہِ الٰہی میں اس کی دعا کی تو ان کی دعا سے اس رسول کے بھیجنے کا فیصلہ ہو گیا۔

کیا یہ ہے؟ مگر میں اس کا کیا کروں کہ:

"کُنْتُ نَبِيًّا وَآدَمَ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ"۔

میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ کا پتلا آب وگِل کے درمیان تھا۔

اس وقت بھی نبی تھا۔ نبی نہیں ہوا تھا یعنی آغازِ نبوت اب بھی نہیں معلوم۔ تو اب جس کے سر پر تاجِ نبوت اس وقت پہنایا جا چکا ہو، اب کیونکر مانوں کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے اس رسول کے آنے کا فیصلہ ہوا۔ تو پھر اس کی نوعیت کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایک آپ کا عمل ہے۔ پہلے اسے سمجھ لیجئے۔ یہ جو درود کے نعرے آپ لوگ لگاتے ہیں۔ نعرہ درود کے معنی بھی تو ایک دعا کے ہیں۔ یہ بھی بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں۔ پروردگار! اپنی رحمت شاملِ حال فرما ان حضرات کے۔ تو اسے سمجھئے کہ کیا ہماری دعا سے رحمت شاملِ حال ہوگی؟ شاید کوئی مؤمن بھی اس تصور کو جائز نہ سمجھے کہ ہماری دعاؤں سے رحمتِ خدا ان کی طرف جائے گی۔ تو پھر ہماری دعاؤں کے معنی کیا ہیں؟ اور پھر ہمیں حکم کیوں ہوا؟ تو اب جو نوعیت میں عرض کروں، اس پر غور کیجئے کہ صحیح ہے یا نہیں کہ ہمیشہ دعا اس لئے نہیں کی جاتی کہ یہ نتیجہ اس سے حاصل ہو بلکہ ایک مخلص وفادار، سمجھدار بندہ، مزاج شناس مالک کا وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے کونسی بات زیادہ پسند ہے۔ تو جو چیز اُسے پسند ہے، تو اُسے وہ اپنی تمنا بنا کر اس کی بارگاہ میں پیش کر دیتا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ اس کی وجہ سے اس پر رحمت ہو بلکہ اس لئے کہ اپنی وفاداری کا ثبوت ہو۔

تو بس اب میرے لئے خلیل کی دعا کا سمجھنا آسان ہوگیا کہ لوحِ محفوظ میں ان کے یہی اوصاف تھے۔ خالق کے دیئے ہوئے علم سے ان کو یہ معلوم تھا کہ یہ رسول ان اوصاف کا مالک آنے والا ہے۔تو جو فیصلہ قدرت تھا، اسی کو اپنی التجا بنا کر اپنی سعادت مندی کیلئے بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیا۔

بس اب یہ پہلا موقع ہے جس موقع پر یہ اوصاف ہمارے کانوں تک پہنچے ورنہ میں نے عرض کیا کہ یہ الفاظ لوحِ محفوظ میں موجود تھے۔ دوسرا موقع تھوڑے سے وقفہ کے بعد دوسرے پارہ کی ابتداء میں شروع ہوا ہے۔ قبلہ کی تبدیلی کے ذکر سے۔ یہی سلسلہ دو صفحات تک چلا گیا ہے۔ اس میں یہ ارشاد ہوا کہ یہ اللہ کی نعمت تھی اور:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴿۱۵۱﴾

یہ ایک احسان تھا جیسے ہم نے بھیجا ایک رسول تم میں، تم میں سے۔ یہاں وہ خود کہہ رہا ہے، وہاں خلیل اس سے کہہ رہے ہیں۔ وہاں ''اٰيٰتِكَ'' تھا کہ تیری آیتیں پڑھتا ہے۔ اب یہاں وہ خود کہہ رہا ہے کہ وہ ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تمہارے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ تمہیں وہ باتیں بتاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

وہی اوصاف جو دعائے خلیل میں تھے، وہی باتیں خالق کے اس ارشاد میں ہیں۔ یہ دونوں جگہیں تو بہت قریب قریب تھیں۔ اب ذرا سا دور چوتھے پارے میں:

لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۱۶۴﴾

یقیناً احسان ہے اللہ کا مؤمنوں پر جس نے ان میں سے رسول بھیجا جو ان کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور تزکیہ نفوس کرتا ہے۔

یہ تیسری جگہ ہے اور چوتھی جگہ بہت دور اٹھائیسویں پارہ میں جا کر۔ بالکل یہی مضمون آیا ہے۔ مگر میں نے جسے سرنامہ کلام قرار دیا ہے۔ وہ سورۂ جمعہ والی آیت ہے۔ اس مضمون کا وہ محل خاص ندرت رکھتا ہے۔ یاد کر لیجئے پہلی دفعہ حضرت ابراہیمؑ نے جو دعا مانگی ہے، اس دعا میں حضرت ابراہیمؑ نے یہ تمنا پیش کی ہے۔ دوسری جگہ تبدیلی قبلہ کے سلسلہ میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ ہمارا ایک احسان یہ تھا کہ ہم نے ایسا نبی بھیجا۔ تیسری جگہ شروع ہی سے اپنا احسان قرار دے کر بیان کیا کہ دیکھو! ہمارا یہ احسان ہے کہ ہم نے یہ نبی بھیجا۔ اور یہاں عجیب شان ہے یعنی یہ سورۂ شروع ہو رہا ہے اوصافِ خدا سے:

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ الۡمَلِكِ الۡقُدُّوۡسِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ﴿۱﴾

اللہ کی تسبیح کرتی ہے ہر شے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کون اللہ؟ وہ اللہ جو حقیقی سلطنت کا مالک ہے۔ کون اللہ؟ جو حکمت کا سرچشمہ ہے۔ کون اللہ؟

جو تمام عیوب و نقائص سے بری ہے۔ کون اللہ؟ جو عزت کا مالک ہے۔ کون اللہ؟ جو قدوس ہے۔ کون اللہ؟ جو عزیز ہے۔ کون اللہ؟ جو حکیم ہے۔

اللہ کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں اور پانچواں وصف بیان ہو رہا ہے:

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

وہ وہی ہے جس نے اُمّیین میں ایک رسول بھیجا۔ انہی میں سے جو ان کے سامنے تلاوتِ آیات کرتا ہے اور ان کے نفوس کی اصلاح کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر چہ اس سے پہلے یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

اب یہاں ندرت کیا ہے؟ خصوصیت کیا ہے؟ اہمیت کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ رسولؐ کا تعارف کروایا جا رہا ہے کہ اللہ ایسا ہے جس نے اس شان کا رسول بھیجا۔ اب کیا اس بندہ کی شان بیان ہو سکتی ہے جس کی شان دکھا کر اللہ اپنی شان کا اندازہ کروائے کہ اس رسول کی شان دیکھو اور پھر سمجھو کہ ہماری شان کیا ہے۔

بے شک وہ خالق ہے، یہ مخلوق۔ بے شک وہ خدا ہے، یہ بندہ۔ لیکن بندہ اس شان کا تو ہو کہ جسے دکھا کر اللہ اپنی عظمت کا تعارف کروائے۔ یہ چھوٹے کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ بڑا اُسے دکھا کر اس کی طرف نسبت دے کر اپنا تعارف کروائے۔ فرض کیجئے کہ کسی شاگرد کو دکھا کر یہ کہا جائے کہ یہ شاگرد ایسا ہے جس کے دو اُستاد ہیں۔ اس سے اس شاگرد کا امتیاز نمایاں ہوگا کہ اس کی وجہ سے اس کے اُستاد کا تعارف ہو سکتا ہے۔ کوئی بیٹا ایسا ہو کہ اس بیٹے کو دکھا کر کہا جائے کہ دیکھو یہ اُن کے بیٹے ہیں۔ تو باپ کے تعارف کیلئے بیٹے کا نام لیا جائے۔ تو یہ خاص بلندی کا پتہ دیتا ہے۔ تو یہ بندے کی معراج ہے کہ بندہ کو دکھا کر خالق کی اپنی عظمت کا تعارف کروایا جائے۔

مجھے انہی خاص بندوں میں اس کی مثال نظر آتی ہے۔ اب میں دکھاتا ہوں کہ چھوٹے کی طرف بڑے کی نسبت کس طرح ہوتی ہے اور وہ بھی کسی خطا کار کی زبان سے نہیں، کسی مخلوق کی زبان سے نہیں، خالق کی زبان سے۔ جب ملک نے پوچھا کہ چادر میں کون ہے؟ تو رسولؐ جس کو دکھا کر اس نے اپنا پتہ دیا تھا، اب اس رسولؐ کو مرکز بنا کر تعارف نہیں کرواتا کہ دیکھو ہمارا رسولؐ ہے اور اس کی بیٹی ہے، اس کے نواسے ہیں اور اس کا داماد یا چچازاد بھائی ہے۔ نہیں۔ اسے مرکز قرار دے کر تعارف نہیں کروایا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے:

"هُمْ فَاطِمَةُ وَاَبُوْهَا وَبَعْلُهَا وَبَنُوْهَا"۔

"ارے وہ کون ہے؟ وہ فاطمہ ہے، اس کا باپؐ ہے، اس کا شوہر ہے، اس کے بیٹے ہیں۔

تو خالق نے وہی نسبتیں قائم کر کے تعارف کروایا سب افراد کا۔ ڈاکٹر اقبال نے جو حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کیلئے کہا ہے:

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز

حضرت مریمؑ ایک نسبت سے صاحب عزت ہیں اور حضرت فاطمہؑ تین نسبتوں سے یعنی کسی کی بیٹی، کسی کی شریک حیات، کن کی ماں۔ حضرت مریمؑ طبقہ خواتین کیلئے معصوم ذات تھیں اور قرآن مجید میں بلاشبہ ان کیلئے بھی آیۂ تطہیر ہے۔ ملائکہ نے صدا دی:

"اِنَّ اللهَ اصْطفكِ وَطَهَّرَكِ۔۔۔عَلَى النِّسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ"۔

اللہ نے آپ کو چنا ہے اور چننا قرآن میں کسی منصب کیلئے ہوتا ہے۔ اس منصب کا نام ہمیں معلوم نہ ہو۔ جو نام معلوم ہیں، نبی رسول، امام۔ ان میں سے کسی منصب کا نام ہم نہیں بتا سکتے۔لیکن بہرحال اگر کوئی منصب نہیں ہے تو چنا کس لئے ہے؟ تو اللہ نے تمہیں چنا ہے اور پاک و پاکیزہ رکھا ہے۔لوگوں نے پاک کیا ہے؟ ترجمہ کیا ہے؟ کیونکہ آیۂ تطہیر میں کچھ نکالنا ہے، لہٰذا ترجمہ یہ کیا آیۂ تطہیر کا:

اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تمہیں پاک کرے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ یہ ظاہر ہو کہ کچھ تھا جس سے پاک کیا۔ آیۂ تطہیر موضوعِ کلام نہیں مگر پھر بھی نظیر پیش کردوں کہ یہی کعبہ کیلئے ہے جس کی تعمیر کا ذکر تھا۔ خالق نے انہی خلیل اور ذبیح کو، انہی ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو مخاطب کر کے ارشاد کیا:

"طَهِّرَا بَيْتِيَ"۔

وہی تطہیر کا لفظ ہے۔ کیا ترجمہ کروں کہ میرے گھر کو پاک کرنا۔ تو کیا اس میں کوئی نجاست پہلے سے تھی؟ ارے جہاں معمار اور مزدور بھی معصوم ہوں، اس گھر میں نجاست؟ توبہ توبہ معاذ اللہ۔ ہاں بیت اور اہل بیت میں فرق اتنا ہے کہ بیت کی تطہیر پیغمبروں سے متعلق کر دی اور اہل بیت کی تطہیر اپنے سے متعلق کی۔

وہ پیغمبروں سے متعلق اور یہ خود اپنے سے متعلق۔ اور اسی سے میں کہتا ہوں کہ نتیجہ میں فرق ہو گیا۔ پیغمبروں کے ذمہ جن کی تطہیر کی تھی، وہ نجاست آ سکی۔ قرآن نے کہا ہے کہ بت عین نجاست ہیں تو وہاں نجاست آ سکی۔ لیکن جن کی تطہیر اپنے ذمہ لی تھی، سلطنتوں کی طاقت ختم ہو گئی لیکن ان کے دامن کردار پر کوئی داغ نہیں لگایا جا سکا۔

بلا شبہ حضرت مریمؑ صاحبِ منصب ہیں، کسی نہ کسی منصب کی حامل ضرور ہیں اور وہ منصب کیا ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے اپنے طبقہ کی عملی رہنمائی کیونکہ عملی رہنمائی طبقہ خواتین کی انبیاء مرسلین نہیں کر سکتے۔ عملی نمونہ تو اسی طبقہ کی کوئی کامل خاتون بن سکتی ہے۔ اس کیلئے ہمیں دورِ اوّل میں حضرت مریمؑ نظر آئیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک خاص منصبِ رہنمائی پر فائز قرار دی گئی۔ مگر اب جو حقیقت میں پیش کر رہا ہوں، اس پر ہر صاحبِ فہم غور کرے۔ وہ یہ ہے کہ عورت کی زندگی کے تین دور ہیں۔ ایک دَور بیٹی ہونے کا، دوسرا بیوی ہونے کا، تیسر اماں ہونے کا۔ اب میں یہاں محسوس کرتا ہوں کہ پہلا دور یعنی بیٹی ہونے والا دور تمہید زندگی ہے اور تیسرا دور یعنی ماں والا دور یہ نتیجہ زندگی ہے۔ اصل زندگی طبقہ خواتین کی وہی ہے بیچ والی جو شریک حیات کے ساتھ متعلق ہے۔ اصل زندگی وہی ہے۔ وہ تمہید ہے، یہ نتیجہ ہے اور اصل زندگی یہ ہے۔ یہی خانہ حضرت مریمؑ کے ہاں خالی ہے۔ وہ بے شک ایک ماں اور باپ کی بیٹی ہیں اور حضرت عیسیٰؑ جیسے بیٹے کی ماں ہیں۔ تیسرا خانہ زندگی کا ہے لیکن وہ جو درمیان کا خانہ ہے جو اصل زندگی ہے، وہ نہیں ہے۔ تو وہ نمونۂ عمل نوعِ انسانی کیلئے قیامت تک کیونکر ہوسکتی ہیں؟ جس طرح حضرت عیسیٰؑ، چونکہ انفرادی زندگی رہی، تنہا زندگی، لہٰذا ان کی نوعیتِ حیات اس بات کا ثبوت ہے کہ خاتم الانبیاء نہیں ہو سکتے۔ خاتم الانبیاء وہی ہوسکتا ہے جو نوعِ انسانی کو اجتماعی اور انفرادی دونوں زندگیوں کیلئے سبق دے سکے، درس دے سکے۔

حضرت عیسیٰؑ نوعِ انسانی کیلئے مثال نہیں بن سکتے تو وہ عبوری دور میں آجائیں۔ ایک نمونہ بھی پیش کر دیں۔ جیسے بچوں کی تعلیم میں بہت سے جملے سکھائے جاتے ہیں۔ عمر بھر انہیں وہی نہیں پڑھنا ہے۔ آجکل اُردو ادب کے

طالب علموں کو میر تقی میرؔ کی اُردو بھی سکھائی جاتی ہے، سودا کی اُردو بھی سکھائی جاتی ہے۔ اس سے پہلے والے دور کی اُردو بھی سکھائی جاتی ہے۔ حالانکہ انہیں نہ وہ اُردو بولنی ہے، نہ لکھنی ہے مگر ان کو نمونہ بتانے کیلئے، چونکہ ارتقاء کے درجوں میں ایک کڑی وہ بھی ہے، لہٰذا اُسے سکھایا جاتا ہے۔ ویسے ہی سلسلہ انبیاء میں ایک قسم کا روحانیت کا نمونہ پیش کرنے کیلئے حضرتِ عیسیٰؑ کی زندگی کو مثال بنا کر پیش کر دیا۔ لیکن خود وہ نوعیتِ زندگی بتاتی ہے کہ یہ مختتم طور پر نمونۂ عمل نہیں ہے۔ ورنہ رہنمائی تو کیا ہو، نوعِ انسانی کا خاتمہ ہی ہو جائے۔

تو معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد حضرت خاتم الانبیاءؐ کی ضرورت تھی۔ بس میں کہتا ہوں کہ جس طرح حضرت خاتم الانبیاءؐ کی ضرورت تھی۔ اسی طرح مریمؑ کے بعد فاطمہؑ زہرا کی ضرورت تھی۔

حضرت فاطمہؑ زہرا سلام اللہ علیہا کی خدمت میں ایک چیز عرض ہے کہ بے شک حضرت مریمؑ کے بعد آپؑ کی ضرورت تھی اور جتنے شعبے ہیں، ان سب کو آپ نے مکمل طور پر بنا کر پیش کر دیا۔ باپؐ کے ساتھ شریک کارِ رسالت ہو کر مباہلے میں آئیں، شوہرؑ کے ساتھ شریکِ حیات، شریکِ زندگی رہیں۔ ہر حیثیت سے ان کے بعد جو بچے تربیت کر کے آپؑ نے پیش کیے، وہ بقائے اسلام کا سبب بنے۔

بے شک آپؑ کے کارناموں کی کوئی نظیر ہی نہیں، کوئی مثال ہی نہیں۔ مگر مخدومہؑ عالم، خاتونؑ جنت، سیدۃؑ النساء، آپ کو اللہ نے کوئی بھائی نہیں عنایت کیا تھا۔ اس لئے آپ کی سیرت کا نقص کوئی نہیں ہے مگر کیا کیا جائے کہ آپؑ کو موقع اس رشتہ کے دکھانے کا نہیں ملا۔ ایک بہن کو بھائی کا ساتھ کس طرح دینا چاہیئے؟ جس طرح اسے سیدۃؑ النساء العالمین مریم کے بعد آپ کی ضرورت تھی۔ اسی طرح آپؑ کے بعد آپؑ کی بیٹی زینبؑ کی ضرورت تھی۔

بخدا! زینبِ کبریٰؑ نے بھائی کے ساتھ اتحادِ عمل کی وہ مثال پیش کی کہ کربلا کے جہاد کے دو حصے ہو گئے۔ ایک حصہ عصر عاشور تک اور ایک حصہ عصر عاشور کے بعد۔ مقصد کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ مگر ایک امتیاز ہے۔ اس کو اس طرح پیش کروں گا، کبھی اس چیز کو ممکن ہے کہ سابق مصائب میں پیش کر چکا ہوں کہ دس محرم تک جو تھا وہ حسینؑ کا عشرہ تھا اور عصر عاشورہ کے بعد سے اب تک، یہ سب زینبؑ کا عشرہ ہے۔ اے اہل عزا! اُس عشرہ کے دنوں کی تعداد میں بتا سکتا ہوں۔ اس کا نام ہی عشرہ ہے لیکن زینبؑ کے عشرہ کی گنتی ہی میں نہیں بتا سکتا اور وہ تاریخ میں نہیں بتا سکتا جس تاریخ کو یہ عشرہ ختم ہوتا ہے کیونکہ تاریخ تو اس وقت بتاؤں جب رہائی اُسی سال ہوئی ہو اور اگر رہائی دوسرے سال ہوئی ہے؟ بخدا! یہ مجبوری ہے کہ بس آٹھ ربیع الاول تک انتہا سے زیادہ سوگ رکھ کے عزا کو ختم کر دیتے ہیں ورنہ جب دوسرے سال رہائی ہوئی ہے تو اب کونسا دن ہے جب یہ سوگ ختم ہو؟

مصائب

اس کی طرف ہمارے ایک معصوم نے اشارہ فرمایا ہے:

امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس ایک صحابی آئے عید کے دن، دیکھا کہ جو کپڑے روز پہنتے ہیں، وہی کپڑے پہنے ہوئے ہیں، نئے کپڑے نہیں پہنے۔ پوچھا: مولاؑ! آج تو عید کا دن ہے، آج تو آپ نے لباس تبدیل فرمایا ہوتا؟ ہمارے چھٹے امامؑ نے فرمایا: کیا کربلا کے بعد ہمارے لئے کوئی عید رہ گئی ہے؟ ایک بات کہوں کہ اگر عید کے دن حسینؑ کا غم نہ ہوتا تو زیارتِ حسین علیہ السلام عید کے دن کیوں پڑھی جاتی؟ عید الفطر میں بھی زیارتِ حسینؑ ہے، عید الاضحیٰ میں بھی زیارتِ حسینؑ ہے۔ غمِ حسینؑ سے کوئی دن خالی رہا ہی نہیں۔ یہ ہے دورِ مصیبت براہِ راست برائے زینبؑ، اور اب میں نے براہِ راست کی قید لگائی کیونکہ جو دَورِ مصیبت ہمارے مولا حسینؑ کا تھا، کیا زینبؑ اس میں شریک نہ تھیں؟ جو بھائی کا امتحان تھا، ہر امتحان میں زینب سلام اللہ علیہا شریک، شدائدِ سفر انہوں نے برداشت کئے، تو کیا حضرت زینبؑ نے نہیں برداشت کئے؟ کربلا میں جب سے آئے تو ساتویں سے پانی بند ہوا، بھائی پیاسا رہا تو کیا بہن کے لب تر ہو گئے؟ مگر مولاؑ کی حدِ عطش معلوم ہے اور وہ عصر عاشور جس کے بعد ہم فاقہ شکنی کر لیتے ہیں، اس کے بعد مولاؑ کی پیاس باقی نہیں رہی ہے لیکن زینبؑ کب تک پیاسی رہیں؟ ہر مصیبت میں زینبؑ بھائی کے ساتھ۔ کونسا داغ انہوں نے اُٹھایا جو انہوں نے نہیں اُٹھایا۔ عباسؑ کے جانے سے اُن کی کمر ٹوٹ گئی تو زینبؑ پر کیا اثر ہوا؟ علی اکبرؑ کے جانے سے ان کی نگاہ کا نور کم ہو گیا۔ تو زینبؑ نے اٹھارہ برس پالا تھا، زینبؑ کو کیا صدمہ ہوا ہوگا اور پھر ایک خاص جملہ یہاں عرض کر دوں، وہ یہ ہے کہ

ارے مولاؑ نے بس عباسؑ اور اُن کے بھائیوں کا داغ اُٹھایا، زینبؑ نے تو حسینؑ جیسے بھائی کا داغ بھی اُٹھایا۔ یعنی جس پر سب کو قربان کر دیا، وہ نہ بچ سکا۔ تو ہر مصیبت میں بھائی کے ساتھ بہن شریک! مگر جب بہن کے امتحان کا وقت آیا تو بھائی بظاہر نہ تھا، بھائی کا سر تھا جو کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک ساتھ ساتھ چلا گیا، بس ایک خصوصیت۔

اہلِ حرم کی بے پردگی پر تو اب بھی دنیا ویسے ہی روتی ہے جیسی اس دورِ جدید سے پہلے روتی تھی، میں کہتا ہوں بے شک عباسؑ نے بڑا جہاد کیا، بے شک علی اکبرؑ نے بڑا جہاد کیا، ہمارے مولاؑ نے بھی تلوار لے کر جو جہاد کیا تو وہ بھی بے نظیر تھا۔ مگر میں ان تمام حضراتؑ کی خدمت میں دست بستہ عرض کروں گا: اے میرے شہزادے علی اکبرؑ، اے میرے چھوٹے آقا عباسؑ، اے میرے مولا حسینؑ! بے شک آپ نے بے نظیر جہاد کیا لیکن آپ نے جو جہاد کیا، خاندانی روایت کے مطابق تھا، حمزہ کے بھتیجے جہاد نہ کرتے تو پھر کون کرتا؟ علیؑ کے بیٹے اور پوتے یوں جہاد نہ کرتے تو پھر کون کرتا؟ مگر زینبؑ نے جو جہاد کیا، ارے جس کی ماں کا جنازہ رات کو اُٹھا ہو، وہ روزِ روشن میں شہر بہ شہر۔

دوسری مجلس

- عام آدمی کیا سمجھ سکتا ہے کہ نبی کیا ہے اور انبیاء کیا سمجھ سکتے ہیں کہ خاتم الانبیاء کیا ہیں۔
- بس مکلف ہم اسی کے ہیں کہ اپنی کشتیِ ذہن کو ان کے کمالات کے سمندر میں ڈال دیں جتنی ظرف میں وسعت ہوگی، اتنا ہی وہ معرفت حاصل کرے گا۔
- نبض کی رفتار بتاتی ہے کہ کتنا بخار ہے تو آپ کسی چیز کو دیکھ کر نہیں سمجھتے۔ ہر ایک کے آثار دیکھتے ہیں اور ان کے آثار کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا۔ تو ہم کب کہتے ہیں کہ خدا کو بے دیکھے مانو، اس کے بھی آثار کو دیکھو اور مانو۔
- خدا کیلئے، بتایئے کہ اگر کتاب کو کافی سمجھتے ہیں تو جتنا کتاب میں ہے، اُسے تو مانئے۔
- کوئی مثال ایسی ہونی چاہئے تھی کہ دنیا لاکھ ترقی کر جائے، پھر بھی پیچھے رہے، آگے نہ جا سکے اور اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ جا کر ہو آئے اور دروازے کی زنجیر ہلتی رہی۔

معرفتِ امامؑ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیۡهِمۡ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ ٭ وَاِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲﴾

وہ ہے جس نے اُمّیین میں ایک پیغمبر بھیجا انہی میں سے۔ جو ان کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ بناتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ مضمون اس سے پہلے قرآن میں تین جگہ ہے مگر یہاں اس کی شان عجیب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا تعارف کروایا جا رہا ہے کہ وہ وہ ہے جس نے ایسا رسول بھیجا۔ اب اس رسولؐ کی عظمت کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اُس کی معرفت حاصل کرنا انسان کیلئے کیونکر ممکن ہے۔ اس کیلئے میں ایک عام اصول آپ کے سامنے پیش کردوں، اسے فرصت کے لمحات میں دیکھئے گا کہ صحیح ہے یا نہیں کہ منزلِ کمال پر پہنچ کر نقص کو سمجھنا آسان ہے مگر منزلِ نقص سے کمال کو دیکھنا اور سمجھنا، یہ تقریباً ناممکن ہے۔ اس کی روزمرہ کی دو مثالیں میں آپ

کے سامنے پیش کرسکتا ہوں۔ ایک یہ کہ بوڑھا سمجھتا ہے کہ جوانی کیا تھی اور جوان جانتا ہے کہ بچپنا کیا تھا۔ مگر بچہ سمجھ سکے گا کہ شباب کیا ہوتا ہے؟ یہ ناممکن ہے۔ دوسری مثال جو زیادہ روزہ مرہ کی ہے، وہ یہ ہے کہ جب جاگتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ سورہے تھے لیکن سوتے میں یہ تصور کرنا کہ جاگیں گے تو کیا ہوگا، یہ ناممکن ہے سوتے میں آدمی خواب دیکھتا ہے تو اسی کو بیداری سمجھتا ہے۔ لیکن خواب کے عالم میں بیداری کا تصور نہیں ہوسکتا۔ بیدار ہونے کے بعد خواب کا تصور ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ایک غیر معصوم کیا سمجھ سکتا ہے کہ معصوم کیا ہوتا ہے؟

یہ تو میں نے عام الفاظ میں کہے ہیں، غیر معصوم اور معصوم۔ اب آگے یہ عام آدمی کیا سمجھ سکتا ہے کہ نبی کیا ہے اور انبیاء کیا سمجھ سکتے ہیں کہ خاتم الانبیاء کیا ہے؟

تو اب کیا کوئی مجھ سے سوال کرنے کا حق رکھتا ہے کہ جب ان کو پہچانا ہی نہیں جاسکتا، انکی معرفت ہی نہیں ہوسکتی تو پھر آپ منبر پر آکر یہ کوشش کیا کرتے ہیں اور غور وفکر کس لئے ہوتا ہے؟ اب اس کے ماوراء دینی دلیل عرض کردوں کہ مذکورہ بات کا خلاصہ یہ تھا کہ بالاتر ہستیوں کی معرفت ممکن ہی نہیں۔ مگر یہ دینی حقیقت ہے کہ معرفتِ خدا واجب ہے۔ ہر بندہ کا فرض ہے کہ معرفتِ خدا حاصل کرے۔ تو جب خدا کی معرفت حاصل کرے گا، حکم ہمیں ہے، تو معرفتِ رسولؐ اور معرفتِ امام کا حکم کیوں نہ ہوگا؟ یہ تو مشہور حدیث ہے:

"مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ إِمَامَ زَمَانِهِ فَقَدْ مَاتَ مَيْتَةً جَاهِلِيَّةً"۔

''جو مر گیا اور اُس نے اپنے زمانہ کے امام کی معرفت حاصل نہ کی،

وہ جاہلیت کی موت مرا''۔

تو اب معرفت ممکن چیز ہے، تبھی تو اس کا حکم ہوا۔ ناممکن چیز کا تو حکم نہیں ہوا کرتا۔ اب یہ دونوں باتیں متضاد ہوگئیں۔ ابھی تو یہ تھا کہ معرفت ممکن ہی نہیں ہے، ابھی یہ ہوگیا کہ معرفت ممکن ہے اور واجب ہے۔ تو اب یہ دونوں باتیں کیونکر سمجھ میں آئیں؟ اس کیلئے کوئی منطقی اور فلسفیانہ تقریر کرنا مقصود نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایک سوئی کو سمندر کے اندر ڈالئے تو سمندر سوئی کے ناکے میں سمانہیں جائے گا۔ مگر جتنا اس کا ظرف ہے، اُتنا تو سمندر اس کے اندر آہی جائے گا۔ بس مکلّف ہم اسی کے ہیں کہ اپنی ذہن کی کشتی کو ان کمالات کے سمندر میں ڈال دیں، جتنی ظرف میں وسعت ہوگی، اتنا ہی وہ معرفت حاصل کرے گا۔

اسی لئے ان باتوں پر بحث کرنا اور لڑنا بیکار ہے، اس لئے کہ سب اگر یکساں معرفت رکھتے تو ایمان کے درجے کیوں ہوتے؟ حضرت پیغمبرؐخدا نے اپنے اصحاب خاص میں ایمان کے درجوں کو مقرر کرکے ہمیں بتایا۔ اب کچھ افراد تو قابل ذکر ہی نہ تھے۔ جہاں سے کہ قابل ذکر سمجھے، وہاں سے ہمیں درجے بتائے کہ ایمان کے دس درجے ہیں۔ ان میں سے آٹھویں درجہ پر مقدادؓ، نویں درجہ پر ابوذرؓ اور دسویں درجہ پر حضرت سلمانؓ فائز ہیں۔ تو کیا یہ درجات ایمان درجاتِ معرفت سے الگ ہیں؟ وہ ایک ہی ہے کہ جب تک معرف کامل نہ ہوگی، ایمان کیسے کامل ہوگا؟ تو جب رسولؐ نے اس میں درجے مقرر کردیئے تو وہ تو آپس میں نہیں لڑتے تھے۔ تو اس طرح جو زیادہ سمجھا ہے، اُسے مبارک ہو، جو کم سمجھا ہے، اُسے بھی مبارک ہو اس میں لڑنے کی ضرورت نہیں۔

مگر اب یہ تین ہستیوں کا ذکر آ گیا تو ایک حقیقت کی طرف میں آپ کی توجہ دلاؤں کہ زبان ہے پیغمبرؐخدا کی۔ جب اس پر یہ تین نام آئے ہیں تو یہ تین

خاص نام ہیں کہ ہمیشہ ساتھ آئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ (مجالس کے فیض سے) جب مقدادؓ کا نام آئے گا تو فوراً ابوذرؓ ذہن میں آئیگے اور فوراً سلمانؓ ذہن میں آئیں گے۔ یعنی یہ شخصیات لازم وملزوم ہوگئی ہیں۔ ایک سے دوسرے کا تصور ہونے لگا۔ تو جو حدیثیں ہیں پیغمبر کی، یہ تین نام ان میں آتے ہیں۔ اب ایک حدیث متفق علیہ، جتنی حالاتِ صحابہ کی کتابیں ہیں، جو عام طور سے متداول کتابیں ہیں۔ ان میں سب سے قدیم علامہ عبدالبر کی استیعاب ہے جو بنواُمیہ کے دارالسلطنت قرطبہ کے عالم تھے۔ اس کے بعد حافظ ابن حجر کی اصابہ ہے اور بھی بہت سی کتابیں ہیں، ان میں متفق علیہ ایک حدیث ہے اور وہ یہ کہ:

"اِنَّ الْجَنَّةَ تَشْتَاقُ اِلٰى ثَلٰثٍ سَلْمَانَ وَاَبِي ذَرٍّوَمِقْدَادَ"۔

یعنی ایک مسلمان مشتاقِ جنت ہوتے ہیں پیغمبرؐ خدا فرمارہے ہیں کہ تین ہستیاں وہ ہیں کہ جنت جن کی مشتاق ہے۔

اب ماشاء اللہ آپ صاحبانِ فکر ونظر ہیں اور صاحبانِ فہم ہیں کہ جنت وابستہ ہوتی ہے آخری انجام سے۔ جب پیغمبرؐ نے جنت کی بات کی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے دیئے ہوئے علم سے آخری نفس حیات تک جائزہ لے کر سند عطا کی ہے۔ تو ارشاد فرماتے ہیں کہ جنت تین افراد کی مشتاق ہے۔ وہی تین: سلمانؓ، ابوذرؓ اور مقدادؓ۔ تو بس یہ بات تو ضمناً آگئی ہے۔ اس کو پھیلانا نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پیغمبرؐ نے ایک ترازو دے دی ہے مسلمانوں کے ہاتھوں میں حق وباطل کے امتیاز کی کہ دیکھو! میرے بعد کوئی دوراہا آجائے تو یہ دیکھو کہ یہ تینوں کدھر ہیں؟

اب سب سے بڑی ذات اللہ کی اور میں نے کہا کہ اللہ کی معرفت واجب مگر اللہ کی معرفت کیلئے قرآن مجید نے خود کیا طریقہ اختیار کیا ہے؟ اُس نے بقراط اور ارسطو کی دلیلیں نہیں پیش کی ہیں، فلسفے کے دور و تسلسل میں قرآن نہیں پڑا ہے، اُس نے یہ کہا ہے کہ اگر اسے سمجھنا چاہتے ہو تو اس کے آثارِ عملی کو دیکھو۔ اس کی صنعتوں کو دیکھو، اس کی کاریگریوں کو دیکھو یعنی آثار کو دیکھ کر اس کا پتہ لگاؤ۔

میں کہتا ہوں کہ آج جو علم وفنون ہیں اور دنیا جن کی دعویدار ہے کہ ہم کسی بات کو بے دیکھے نہیں مانتے تو میں کہتا ہوں کہ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی آپ ہر چیز کو دیکھ کر مانتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب آئے تو انہوں نے تھرمامیٹر لگا کر کہا کہ اتنے ڈگری بخار ہے۔ کیا بخار تھرمامیٹر میں آ گیا ہے اور دکھائی دیا ہے؟

توحضورِ والا! اس کا اثر آپ کو معلوم ہے کہ اتنے ڈگری بخار ہو تو پارہ یہاں تک پہنچتا ہے۔ وہ تلازم آپ کو معلوم ہے تو اس لئے اثر کو دیکھ کر مؤثر کو سمجھتے ہیں۔ حکیم صاحب نبض کو دیکھتے ہیں تو کیا اس کا بخار سمٹ کر نبض میں آجاتا ہے اور نبض کو بھی دیکھتے نہیں ہیں، ہاتھ کلائی پر رکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں نبض کی رفتار کو۔ انہیں اپنے فن کے لحاظ سے وہ تعلق معلوم ہے جو بخار کو نبض کی رفتار بتاتی ہے کہ کتنا بخار ہے؟ تو آپ کسی چیز کو دیکھ کر نہیں سمجھتے، ہر ایک کے آثار دیکھتے ہیں اور ان آثار سے کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا۔ تو ہم کب کہتے ہیں کہ خدا کو بے دیکھے مانو، اس کے بھی آثار دیکھو اور مانو۔

تو اس کی معرفت کا ذریعہ یہی ہے کہ اس کے کام دیکھئے اور کاموں کے ذریعے سمجھئے کہ وہ ذات کیسی ہوگی جس نے ایسے کام انجام دیئے۔ قرآن مجید نے

اپنے پیغمبرؐ کے اوصاف بیان کرنے کیلئے کہ یہ رسولؐ کیسا ہے؟ اس آیت میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ کام بیان کئے ہیں جو خدا کی طرف سے ان کے ذمہ ہیں اور اس کے بعد انسانی ذہن پر بار ڈالا ہے کہ اب سوچو کہ ان کاموں کے کرنے کیلئے کیسا چاہیئے؟ جب اُس نے یہ کام ان کے سپرد کئے ہیں تو اب اس ذات کا اندازہ کرو جس کے سپرد اللہ نے یہ کام کیے ہیں۔ اس آیتِ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان کاموں کی تفصیل درج ہے جو خالق کی جانب سے خاتم الانبیاءؐ کے سپرد ہیں۔ تو ان میں سے پہلا کام تلاوتِ آیات ہے۔ اس کے کتاب کی تلاوت کرنا۔ آیتِ الٰہی کی تلاوت کرنا۔ دوسرا کام نفوس کو پاک و پاکیزہ بنانا۔ نفوس کی اصلاح کرنا۔ یہ دوسرا کام۔ تیسرا کام جو ہے، اس میں دو کام ہیں۔ الفاظ ایک ہیں معنی دو ہیں۔ ایک کتاب کی تعلیم دینا، دوسرے حکمت کی تعلیم دینا۔ تو ایک کام ہوا، کتاب کی تعلیم اور ایک کام حکمت کی تعلیم۔ یہ چار کام اس نے اپنے رسولؐ کے ذمے کئے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ان کاموں ہی سے ایک بحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اگر قرآن کافی ہوتا تو فریضہ رسولؐ صرف ''يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ'' پر ختم ہو جاتا۔ جب تلاوتِ آیات کر دی تو وہ کتاب پہنچ گئی ہے۔ اب وہ کتاب کافی ہے تو رسولؐ کا اس کے آگے کام ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ مگر یہاں بات اور آگے بڑھے گی۔ یہ تو گویا ابجد ہے تعلیم رسولؐ کے نفاذ کی۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ

''یہ اس کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں''۔

اس کے بعد یہ ہے:

یُزَکِّیھِمۡ

''ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ بھی بناتے ہیں''۔

یہ دوسرا کام ہوا۔ تیسرا کام ان کا یہ ہوا کہ تعلیم دیتے ہیں کتاب کی۔ اب کیا یہ کوئی اور کتاب ہے؟ وہی تو کتاب ہے جس کی آیات یہ سناتے تھے۔ اور جس وقت سنا رہے تھے، وہ سب اہلِ زبان تھے، عربی دان تھے۔ خود عرب۔ اس کے باوجود تلاوتِ کتاب کرتے ہیں۔ اس کی آیتوں کو پڑھتے ہیں اور پھر تعلیم بھی دیتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اہل زبان جو عرب تھے، وہ بھی بغیر رسولؐ کی تعلیم کے قرآن کو نہیں سمجھتے تھے۔

آجکل کے حضرات ترجمے دیکھ کر سمجھتے ہیں۔ قرآن کا ترجمہ پڑھ لیا، سمجھ گئے، علم قرآن حاصل ہوگیا۔ ابھی دو منٹ کی بات ہے، ایک صاحب تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ میں تفسیر قرآن لکھ رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ عربی سے واقف ہیں؟ کہا: جی نہیں۔ عربی سے واقف نہیں۔ تو میں نے کہا کہ وہ قرآن کی تفسیر نہیں ہوگی، ترجموں کی تفسیر ہوگی۔

جو اہل زبان تھے، وہ بھی رسولؐ کی تعلیم کے بغیر نہیں سمجھتے تھے، کتاب کی تعلیم رسولؐ نے دے دی لیکن پھر بھی کچھ باقی رہ گیا۔ جس کیلئے تعلیم کتاب کے بعد چوتھی کلاس تعلیم حکمت کی قائم ہوئی۔ یہ حکمت وہ فلسفہ نہیں ہے جس کے ارسطو وغیرہ عالم تھے۔ یہ حکمت وہ ہے جو اسرارِ کتاب ہیں۔ جو رموزِ کتاب ہیں۔ آخر چار درجے کیوں قرار دیئے گئے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ طالب علموں کی صلاحیت کے لحاظ سے ہے۔ ایک کلاس عام ہے، وہ تلاوتِ کتاب کی ہے۔ اس میں تو مومن و کافر کی بھی تفریق نہیں۔ پیغمبرؐخدا کعبے میں جا کر جتنے لوگ گرد و پیش

ہیں ، انہیں قرآن پڑھ کر سناتے ہیں۔تو اس میں تو دیکھا نہیں جاتا کہ کون سن رہا ہے اور اگر سنائیں نہیں تو حجت کیونکر قائم ہو؟ پھر کافر پر کفر کا الزام کیونکر آئے؟ پھر اُسے سزائے کفر کیوں ملے؟اب جب آپ نے قرآن پڑھ کر سنایا تو اس سے کچھ نے اثر لیا۔ کچھ نے اثر نہ لیا۔جنہوں نے کچھ بھی اثر نہ لیا، وہ کافر کے کافر رہے۔تو اب جب انہوں نے اسلام قبول ہی نہیں کیا تو فرائض رسولؐ ان کی نسبت ختم ہو گئے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ مدرسہ ہدایتِ رسولؐ سے ان کا نام خارج کر دیا گیا۔لیکن جنہوں نے اثر قبول کیا، یعنی مسلمان ہو گئے، اب وہ دوسری کلاس میں داخل کئے گئے جو تزکیہ نفوس کی کلاس ہے۔اب ان کے نفوس کی اصلاح کی جائے گی۔عبادات کے احکامِ تزکیہ نفس کیلئے ہیں۔اسی لئے عبادت کا حکم دیا جا رہا ہے تو کہا جا رہا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا۝۱۰۳

نماز مؤمنین پر فرض ہے جو بہ اعتبارِ اوقات مقرر ہے۔

روزہ کا حکم دیا جاتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡکُمُ الصِّيَامُ

''اے صاحبانِ ایمان! تم پر روزہ فرض ہے۔''

اب ہر جگہ انہیں پکارا جا رہا ہے جو پہلی کلاس پاس کر چکے ہیں اور وہ، وہ ہیں جو ''ایھا الذین اٰمنوا'' میں کم سے کم بقلم خود شامل ہیں۔اب ان کیلئے یہ فریضہ ہو گیا۔ان کو احکام دیجئے، ان کے نفوس کے تزکیہ کیلئے جو سامان ہیں، ذرائع ہیں، وہ انہیں بتایئے اور سکھایئے۔

تو فریضۂ رسالت ان کیلئے آگے بڑھا۔''یُزَکِّیۡهِمۡ'' کہ یہ ان کا

تزکیہ نفس بھی کریں۔ ان کے نفوس کی اصلاح بھی کریں۔ جب پہلی کلاس میں ہر ایک نے دیکھ لیا کہ ہر ایک نے اثر قبول نہیں کیا۔ ارے اگر ہدایتِ پیغمبرؐ میں ایسی کیمیاوی تاثیر ہوتی کہ جبری طور پر تبدیلی ہیئت کردے، ماہیت بدل دے تو فوراً سب مومن کیوں نہ ہوجاتے؟ معلوم ہوا کہ جیسے ہدایتِ الٰہی میں جبر کارفرما نہیں ہے، ورنہ کافر کا وجود نہ ہوتا، اسی طرح ہدایت پیغمبرؐ میں وہ کیمیاوی اثر نہیں دیا گیا ہے کہ ایک دم سننے والا بدل جائے۔ جبھی تو سننے کے بعد کچھ مسلمان ہوئے، کچھ نہیں ہوئے۔

تو جب پہلے فیض میں، پہلے درجہ تعلیمی میں، پہلی کلاس میں ہم نے دیکھ لیا کہ کچھ نے اثر قبول کیا، کچھ نے نہیں کیا تو دوسرے درجہ میں یہ کیسے ہوگا کہ جب مسلمان ہوگئے تو سب برابر ہوگئے؟ اب اس کلاس میں بھی کچھ پر پورا اثر ہوگا، کچھ پر ناقص اثر ہوگا، کچھ پر بالکل نہ ہوگا۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ پیغمبرؐ کے جلسے میں شریک ہوتے ہیں، نماز کے بعد حضرتؐ کی تقریر سنتے ہیں۔ اگر مسلمان نہ ہوتے تو پھر رسولؐ کا خطبہ کیوں سنتے؟ مگر جونہی وہاں سے اٹھتے ہیں تو، قرآن کہہ رہا ہے، کوئی روایت نہیں بیان کررہا ہوں، کہ فوراً آپس میں کہتے ہیں؟ یہ ابھی کیا کہا تھا؟ ''ماذا قال''۔ یہ ابھی کیا کہا تھا؟ ارے خود سن رہے تھے، دوسرے سے کیوں پوچھ رہے ہو کہ ابھی کیا کہا تھا؟

معلوم ہوتا ہے کہ اُچاٹ ذہن کا طالب علم ہے جو کلاس میں بیٹھتا ہے مگر ذہن کہیں اور ہوتا ہے۔ یہ قرآن مجید کردار بیان کررہا ہے۔ اس معزز گروہ کا جو پیغمبرؐ کے آس پاس ہے اور حضرت کا خطبہ سن رہا ہے اور اسی وقت پوچھ رہا ہے کہ ابھی کیا کہا تھا؟ یعنی ابھی سنا تھا، ابھی بھول گئے کہ کیا کہا تھا۔ سمجھے ہی نہیں کہ کیا کہا تھا؟

تو اب بتایئے ان پر اثر ہوگا؟ تو اب جب اثر نہ ہوا تو فریضہ رسولؐ ان کی نسبت ختم ہوگیا۔ اب وہ تیسری کلاس میں، جو علم الکتاب کی ہے، اس میں داخل نہیں کئے جائیں گے۔ اب یہ الفاظ یاد کرلیں۔ کتاب کے معنی ان تک نہیں پہنچ سکتے۔ علم الکتاب کی کلاس میں یہ داخل نہیں کئے گئے کیونکہ اس کی پہلی کلاس ہی میں فیل ہوگئے۔ اب وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی اور انہوں نے علم الکتاب سے فیض حاصل کرلیا، وہ اس لائق ہوں گے، چنے ہوئے حضرات جنہیں رموزِ کتاب بتائے جائیں، انہیں اسرارِ کتاب بتائے جائیں۔ وہ چوتھا درجہ ہے حکمت کا۔ اس کے بارے میں قرآن نے کہا ہے:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ

جسے حکمت عطا ہوگئی، اُسے بہت بڑی خیر عطا ہوگئی۔

اب مجھے ایک اور مکتبِ خیال یاد آگیا جو کہتا ہے کہ پیغمبرؐ خدا کی حیثیت، میں تو معاذ اللہ کہہ کر ہی کہوں گا، کہ آپ کی حیثیت معاذ اللہ ایک چٹھی رساں کی سی تھی۔ ارے خدا کی کتاب ان کے نزدیک چٹھی کی سی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات اس وقت صحیح ہوتی اگر فریضۂ رسولؐ "يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ" پر ختم ہوجاتا۔ تلاوتِ آیات کردی، چٹھی پہنچادی۔ اب جاکر اطمینان سے گھر بیٹھیں۔ مگر ان کا کام تو ختم نہیں ہوا۔ قرآن نے کہا: "يُزَكِّيْهِمْ"۔ یہ ان کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں۔ تو کیا چٹھی رساں کا کام یہ ہے کہ وہ ہر ایک کے گھر جاکر پوچھے کون ان میں سے سچ بولتے ہیں، کون جھوٹ بولتے ہیں؟ کون امین ہیں؟ کون خائن ہیں؟ کون نمازی ہیں؟ کون غیر نمازی ہیں؟ کیا چٹھی رساں کا یہ کام بھی ہے؟

اس کے بعد یہی نہیں بلکہ علم الکتاب کے بھی بتانے کے ذمہ دار یہ ہیں۔
چٹھی رساں تو بعض اوقات اس زبان کو بھی نہیں جانتا جس میں لکھا ہوا خط اس نے لا کر دیا ہے۔ تو کیا چٹھی رساں کو روک کر آپ کہئے گا کہ ارے بھئی! یہ خط پڑھتے بھی تو جاؤ۔ وہ کہے گا کہ میرا کام چٹھی پہنچانا تھا، میرا کام اس خط کو پڑھنا نہیں تھا۔ مگر خالق کہہ رہا ہے:

"یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ"۔

ارے یہ کتاب کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ علم الکتاب بھی ان کے ذریعہ سے ملے گا اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس چٹھی رساں سے پوچھئے کہ اصل مطلب لکھنے والے کا کیا ہے؟ اس کے راز بھی بتائیے، اس کے رموز بھی بتائیے تو برائے خدا بتائیے کہ اگر کتاب کو کافی سمجھتے ہیں تو جتنا کتاب میں ہے، اُسے تو مانئے۔

لیجئے! اب ایک اور بات یاد آ گئی، وہ ایک ہی بات ہے، اُسے غلاف میں لپیٹ لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی کسی دوسرے نعرے کی صورت میں کہہ دیا، کبھی کسی فلسفے کی صورت میں کہہ دیا کہ مآخذ دین فقط کتاب ہے، سنت نہیں۔ ہے وہی بات کہ کتاب کافی ہے۔ یہ وہی نعرہ ہے جو پروان چڑھ رہا ہے مختلف صورتوں میں کہ مآخذ دین بس کتاب ہے سنت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسی ایک آیت سے اس کا بھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ تلاوتِ آیات کرتے ہیں۔ لیجئے جناب! کتاب تو پہنچ گئی۔ اب "یُزَکِّیۡهِمۡ"، یہ تزکیہ نفس کرتے ہیں۔ اب وہ الفاظ جن سے تزکیہ نفس ہوتا ہے، وہ کب جزوِ کتاب ہیں، وہ آپ ہی کے اقوال سے ہوں گے اور آپ ہی کے افعال سے ہوں گے جو سب جزوِ سنت ہیں اور اس کے بعد اتنا ہی نہیں، "یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ"، یہ کتاب کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ تو اب

تعلیم کیلئے جو تشریحات یہ کرتے ہیں وہ جزوِ کتاب ہوتے تو تلاوت میں پہنچ نہ جاتے۔ معلوم ہوا کہ وہ سب ان کے ارشادات ہی ہیں جن کے ذریعہ سے کتاب کی تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد حکمت کی تعلیم بھی یہ دیتے ہیں۔

اب جن الفاظ کی مدد سے حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، وہ بھی جزوسنت ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب تو ایک چوتھائی دین کی حامل ہوئی۔ جس نے کتاب کو لے کر سنت کو چھوڑ دیا، اُس نے ایک چوتھائی دین اختیار کیا، تین چوتھائی دین چھوڑ دیا۔

توغرض یہ چار کام ہیں جو پیغمبرؐخدا کے ذمہ ہیں جن کی تفصیل میں نے بتائی۔ اب یہ معلم کی سوجھ بوجھ پر منحصر ہے کہ اس نے ہر درجہ کیلئے ان لوگوں کو منتخب کیا جن پر اثر ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب پیغمبرؐخدا کی سوجھ بوجھ پر منحصر ہے۔

یاد رکھئے کہ کتاب بے زبان ہے۔ وہ اس سوجھ بوجھ کو نہیں رکھ سکتی۔ پہلا کام جو پیغمبرؐخدا کے سپرد کیا گیا، وہ دیکھئے کہ کتنا اہم ہے! تلاوتِ آیات، یہ بظاہر ہمارے نزدیک بہت آسان ہے۔ قرآن اُٹھاتے ہیں اور پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ تلاوت کہتے کسے ہیں؟ الفاظ جو نازل شدہ ہیں، انہی کو پڑھے، تب تلاوت ہوگی۔ میں ترجمہ پڑھ کر سناؤں تو کیا وہ تلاوت ہوگا؟ یہ عیسائیوں کا تصور ہے کہ ہر زبان والی بائبل ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ تصور نہیں ہے۔ اصل قرآن تو وہی ہے، یہ سب ترجمے ہیں۔ تو یہ ترجمہ سنانا ہوگا، تلاوت نہیں ہوگی۔ کیوں؟ اس سے کہ زبان بدل گئی۔ وہ عربی تھی، یہ اُردو ہوگئی۔

اچھا! زبان بھی وہی رہے لیکن الفاظ بدل جائیں، تب بھی آپ کہیں گے کہ یہ تلاوت نہیں ہوئی۔ اب یہ نیت پر ہے یا وہ تشریح ہوگی یا تحریف ہوگی۔ الفاظ بالکل وہی رہیں، ترتیب بدل جائے!

"فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِہٖ خِیۡفَۃً مُّوۡسٰی"۔

اب ماشاء اللہ صاحبانِ علم موجود ہیں کہ عربی قواعد میں فعل کے بعد پہلا درجہ فاعل کا ہے، پھر مفعول کا درجہ ہوتا ہے۔ اب کوئی اُستاد طالب علم کو بتانے کیلئے یوں کہے:

"فَاَوۡجَسَ مُوۡسٰی خِیۡفَۃً فِیۡ نَفۡسِہٖ"۔

کوئی لفظ گھٹا ہے نہ بڑھا ہے۔ بالکل وہی الفاظ ہیں جو آیت میں تھے۔ صرف موسٰیؑ اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ رکھ دیا گیا ہے۔ تو اس طرح بات تو وہی ہے لیکن یہ پیغام بھیجنے والے کا کلام نہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک صاحب کو کسی نے کوئی پیغام پہنچانے کیلئے دیا۔ اب وہاں تک جاتے جاتے بیچارے ایک لفظ بھول گئے مگر مطلب سمجھ لیا تھا، اس لئے فوراً ذہن میں اس کی جگہ دوسرا لفظ سوچ لیا اور جا کر کہہ دیا کہ یہ پیغام دیا ہے۔ اب اگر پیغام دینے والے کو پتہ نہیں چلا تو خیر مگر اب یہ واپس آئے اور انہوں نے کہا کہ کیا کہا تھا؟ اب انہیں اپنے الفاظ یاد تھے، کہا: میں نے یہ کہا ہے۔ کہا: میں نے یہ تو نہیں کہا تھا؟ میں نے تو یوں کہا تھا۔ تو وہ تصدیق نہیں کریں گے کہ میرا کلام پہنچایا۔

اب یہ دیکھئے کہ یہ رسولؐ نہیں فرما رہے ہیں کہ میں تلاوت کرتا ہوں، آیاتِ خدا کی، بلکہ جس کا کلام ہے، وہ کہہ رہا ہے کہ یہ ہماری آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ پھر ماشاء اللہ صاحبانِ علم موجود ہیں۔ ماضی کا صیغہ نہیں ہے جو ایک واقعہ خاص کا پتہ دے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کی تلاوت کر دی، بلکہ مضارع ہے جو استمرار کا پتہ دیتا ہے۔ یہ ہماری آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ یعنی ان کا طریقہ یہی ہے، ان کی شان یہی ہے، ان کا شیوہ یہی ہے کہ ہماری آیتوں کی

تلاوت کرتے ہیں۔۔اس میں ماضی بھی داخل ہے، اس میں حال بھی داخل ہے اور مستقبل بھی داخل ہے۔ سب زمانے داخل ہیں۔ وہ تصدیق کر رہا ہے کہ یہ ہماری آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں، نہ اس میں کمی ہوتی ہے، نہ زیادتی ہوتی ہے۔ نہ اُدھر کا لفظ اِدھر ہوتا ہے اور نہ ادھر کا لفظ اُدھر ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی دلیل عقلی نہ ہوتی اور کوئی دلیل نقلی بھی نہ ہوتی تو آیت کا یہ جزو رسولؐ کے سہوونسیان سے بری ہونے کیلئے کافی تھا۔ اس ایک جزو ''یَتْلُوا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ'' میں کتنی رفعت ہے، کتنی بلندی ہے اور اس کے بعد ''یُزَکِّیْهِمْ'' ان کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ کوئی صفت دوسرے تک نہیں پہنچائی جاسکتی جب تک کوئی اس صفت کا خود حامل نہ ہو۔ خالق کہہ رہا ہے کہ یہ دوسروں کے نفوس کو طاہر کرتے ہیں، پاک کرتے ہیں تو یہ تنہا ''یُزَکِّیْهِمْ'' خود ایک آیت تطہیر ہے۔

یہ اس کی تصدیق ہے کہ ان کا نفس پاک ہے، اس کے معیار پر پاک ہے۔ یہاں جناب! ''پاک کرے گا'' نہیں ہے، کہ کوئی سمجھے کہ کچھ ہے، جب تک پاک کیا۔ ''پاک کرے گا'' نہیں ہے، پاک ہے اور اس کے بعد ''یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ''، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ کتاب کی تعلیم دیتے ہیں، ایک کام اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، دوسرا کام۔ اور یہ کام جب تک کیلئے ہے کہ جب تک ان کی رسالت ہے۔ کتاب کی تعلیم بھی، حکمت کی تعلیم بھی۔ تو اب یہ معلم ہیں نوعِ انسانی کے، کب تک؟ جب تک رسالت ہے اور رسالتِ پیغمبر کب تک؟ قیامت تک۔ میں کہتا ہوں کہ قیامت تک کہنا بھی ہمارے حدودِ تعبیر کی کوتاہی ہے۔ کون کہتا ہے کہ قیامت کے آنے سے انکی رسالت ختم ہے؟ اگر قیامت کے آنے سے ان کی رسالت ختم ہے تو

شفاعت کس اعتبار سے۔۔۔۔۔؟

تو رسالت میں تو میرے نزدیک قیامت کی قید لگانا درست نہیں ہے۔ رسالت تو لامحدود ہے۔ مگر ہاں! تعلیم۔ اسے کہہ لیجئے کہ قیامت تک ان کے ذمہ ہے کیونکہ جب تعلیم حاصل کرنے والے نہیں رہے تو کلاس کن کیلئے۔ لہٰذا کتاب وحکمت کی تعلیم تا قیامت۔

صاحبِ علم حضرات کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ معلم کسی کلاس کا کیسا ہونا چاہئے؟ اب اس کی ذرا تشریح کروں گا کہ اگر کوئی معلم ایسا ہے کہ چھ مہینے تک تو بچوں کو اس سے پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہو اور چھ مہینے کے بعد بچے اس کے برابر آجاتے ہوں اور دو مہینے کے بعد اس سے زیادہ سمجھنے لگتے ہوں تو کیا یہ معلم ہو؟ سب سمجھ گئے کہ نہیں، اس لائق تو نہیں ہوسکتا۔ اب اگر کسی معلم سے پانچ برس تک کی تعلیم متعلق ہے، تو یہ اگر ایسا ہے کہ سال بھر کے بعد طالب علم برابر آجاتا ہو، پھر آگے بڑھ جاتا ہو، کیا وہ معلم اس لائق ہے؟ اب پانچ سے دس سے بیس برس کی بات کریں۔ ایک اصول کیا قائم ہوا؟ کہ جتنے بھی زمانے کیلئے کوئی شخص معلم ہو، جتنی ممکن ترقی طالب علموں کے دماغوں کی، اتنے زمانہ میں ہوسکتی ہو، معلم کو اُس سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ جب وہ معلم بنایا گیا، اُسی وقت ورنہ وہ مستحق نہیں ہے کہ معلم بنایا جائے۔ اب جسے خالق نے قیامت تک کیلئے معلم بنایا ہو، تو بر بنائے اصولِ تعلیمی، قائل ہونا پڑے گا کہ عالم الغیب خدا کے علم میں جتنی امکانی ترقی نوعِ بشر کی قیامت تک ہے، اُس سے یہ معلم اونچا ہوگا، جب اس نے معلم بنایا ہے۔

اب انسان روزِ قیامت تک کتنی ترقی کرسکتا ہے ہے؟ وہ ہم اور آپ اس وقت سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ارے جس لائن میں ترقی کررہا ہے، ہے تو ذہن کی

ترقی، چاہے مصرف غلط ہو۔ ترقی کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔ تو انسان کتنی ترقی کر سکتا ہے؟ اس کی رفتار یہ ہے کہ اس کو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ دس برس بعد کیا ہوگا اور بیس برس بعد کیا ہوگا؟ جب کہ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ تیس برس پہلے کہا جاتا تھا کہ یہاں بیٹھ کر تم دہلی کی آواز سنو گے اور کوئی نہیں مانتا تھا۔ آج تو راستہ چلتے دنیا بھر کی آوازیں آرہی ہیں۔

ارے کسی وقت تو چائے خانوں، ہوٹلوں میں جانے کی ضرورت تھی، اب تو ساتھ لئے پھرتے ہیں اور جہاں ہیں، وہاں دنیا بھر کی آوازیں سن رہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کتنے تھے کہ صرف آواز سن رہے ہوں۔ جہاں کی بات سنو گے، وہاں کی تصویر بھی دیکھ لو گے۔ اسے اگر دس بیس برس پہلے کہا جاتا تو کوئی تسلیم نہ کرتا۔ کہنے والے کو دیوانہ کہا جاتا۔ لیکن اب۔؟ پہلے تو ذرا کمیاب تھا، بعض گھروں میں تھا۔ اب تو ہر گھر میں یہ بھی ہو گیا کہ یہاں سے بیٹھ کر پورا منظر دیکھئے، چاہئے دیکھنے کو ہو، چاہئے دیکھنے کا نہ ہو۔ وہ الگ بات ہے۔ تو یہ بات ابھی دس بیس برس پہلے سمجھ میں نہ آتی۔ تو اب جب رفتار ترقی یہ ہے تو دس برس بعد کیا ہوگا، بیس برس بعد کیا ہوگا اور سو برس بعد کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ مجھے تو آسانی اس میں محسوس ہوئی کہ یہ ترقیاں جو ہو رہی ہیں اور بہت سی ہو چکی ہیں، یہ کن لائنوں پر ہو رہی ہیں؟ کس چیز میں یہ ترقیاں ہو رہی ہیں؟ تو میری تو سمجھ میں یہ آیا کہ یہ تمام ترقیاں دو چیزوں میں ہو رہی ہیں: ایک سرعتِ رفتار، ایک شدتِ اختصار۔ مہینوں کی مسافت ہفتوں میں طے ہونے لگی، پھر ہفتوں کی مسافت دنوں میں۔ اس کے بعد دنوں کی مسافت منٹوں میں طے ہونے لگی۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ثانیوں اور دقیقوں میں طے نہ ہوگی۔ بہت سے کام جو ایک جماعت مل کر ایک عرصہ میں کرتی، وہ ابھی تھوڑی

دیر میں مشینوں کی مدد سے ہوجاتے ہیں۔

تو تمام ترقیاں ان دو چیزوں میں: ایک سرعتِ رفتار، دوسری شدت اختصار۔تو جو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے، اس کے واقعاتِ حیات میں کوئی مثال ایسی ہونی چاہئے تھی کہ دنیا لاکھ ترقی کر جائے، پھر بھی پیچھے رہے، آگے نہ جا سکے۔ اور اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ جا کر ہو آئے اور زنجیر ہلتی رہے۔

یاد رکھئے کہ جب وہ دنیا میں تشریف لائے تھے تو اس وقت انسان کی سمتِ سفر چار تھیں: مشرق، مغرب، شمال اور جنوب۔ اگر اسی وقت کے معلم ہوتے تو اسی دنیا میں گھما پھرا کر پہنچا دیئے جاتے۔ مگر بھیجنے والے کو معلوم تھا کہ انسان کی سمتِ سفر بدلے گی۔ یہ چاند تک پہنچے گا اور ستاروں تک پہنچنے کی کوشش کرے گا اور کون کہہ سکتا ہے کہ نہیں پہنچے گا۔ جب چاند تک پہنچ گیا تو ستاروں تک بھی پہنچ سکتا ہے۔تو اب سمتِ سفر ادھر ہوگئی۔ تو جسے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے، اس کیلئے لازم ہے کہ اُسے اتنی دور تک پہنچا دیا جائے کہ اب لاکھ انسان اونچا ہو جائے، پھر بھی پیچھے رہے، آگے نہ جا سکے۔

میں تو کہتا ہوں کہ ابھی انسان چاند تک گیا ہے، جسے ہمارے ریاضی والے کہتے ہیں کہ فلک الدنیا پر ہے۔ فلک الدنیا یعنی سب سے نیچے کا آسمان جو بس ہمارے اوپر ہے۔ وہاں تک ابھی انسان کی پرواز ہوئی ہے مگر اس کے آگے اب یہ چاہے جہاں جائے، ستارہ مریخ تک جائے، زہرا تک جائے، عطارد تک جائے، اب میں کہتا ہوں کہ ستارہ زحل تک پہنچ جائے۔ ستارہ زحل سب سے اونچا ہے ان میں۔ وہاں تک بھی پہنچ جائے تو میں کہوں گا کہ ہمارے رسولؐ کا روندا ہوا راستہ ہے۔

ایک بڑی بحث ہے، اس کا تجزیہ اسی سے ہوجاتا ہے، اتنے ہی سے ہوجاتا ہے۔ عقلی ضرورت جو معراج کی ہے۔ اب غور کر لیجئے کہ یہ چاند تک گئے

ہیں، یہ اگر روحانی طور پر گئے ہوں تو معراجِ روحانی مان کر بات بن جائے گی اور اگر یہ سب جسم سمیت گئے ہوں تو اپنے رسولؐ کو ان سے پیچھے نہ سمجھئے۔ یہ منزل تھی ان کی جو افضل المرسلین قرار دیئے گئے، خاتم النبین قرار دیئے گئے اور ان کا مرتبہ تمام رسولوں میں برتر ہو۔ عام طور تو ذہن میں آتا ہوگا کہ یہاں سے باب مصائب بہت دور ہے لیکن فضائل ومصائب اتنے دست وگریباں ہیں کہ مجھے منتقل ہونے میں کبھی کوئی دقت نہیں ہوئی۔

یہی وہ حقیقت ہے کہ جس پر شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کتاب ''سرالشہادتین'' کی پوری بنیاد قائم ہے۔ اہل علم حضرات واقف ہوں گے کہ خاندانِ ولی اللہ کو ایک خاص عظمت واہمیت حاصل ہے۔ یہ ان کی اولاد ہیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ سب سے منفرد تھے۔ ان کے تعارف کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ صاحبِ تحفہ اثناء عشریہ ہیں یعنی اس کتاب کے مصنف جس کے نہ معلوم کتنے ایڈیشن چھپ چکے ہیں، ان کی ایک کتاب ''سرالشہادتین'' جتنے شہادت نامے اس وقت ہیں، چاہے یہاں ہوں، چاہے وہاں ہوں، سب کا مآخذ، سب کی بنیاد اسی پر قائم ہوتی ہے۔ اسی کے ترجمے ہوئے: ''ذکرالشہادتین''، ''تقریرالشہادتین''، ''تحریرالشہادتین'' مختلف زبانوں میں۔ تو سرالشہادتین کی بنیاد اسی چیز پر ہے یعنی بنیاد فضیلتِ رسولؐ پر ہے۔ سرالشہادتین کا ترجمہ ہے ''دوشہادتوں کا راز''۔ ابھی تو شاید سمجھ میں نہ آئے کہ دوشہادتوں کا راز اور اس کی بنیاد فضیلتِ پیغمبرؐ خدا پر ہے۔ مگر پوری کتاب کی داغ بیل اسی بنیاد پر ہے کہ ہمارے پیغمبر تمام پیغمبروں سے افضل ہیں۔ کوئی فضیلت کسی رسول یا نبی کو نہیں ملی مگر یہ کہ اس کی مثل یا اس سے بہتر فضیلت ہمارے رسولؐ کو حاصل ہوئی ہے۔ بالکل خلاصہ عرض کرر ہا ہوں۔ ان فضائل میں جو پیغمبرؐ خدا کو حاصل ہوئے،

ایک فضیلتِ شہادت بھی ہے یعنی بہت سے انبیاء ایسے ہیں جو راہِ خدا میں شہید ہوئے ہیں، جنابِ زکریاؑ، جنابِ یحیٰؑ، ہماری مجالس میں ذکر ہوتا رہتا ہے، ہماری مجالس بھی بہت بڑا مدرسہ ہیں دینیات کا۔ ہمارے پیغمبرؐ پر اگر کسی دشمن کا حربہ کارگر ہوجاتا اور وہ نمایاں طور پر شہید ہوجاتے تو شاہ عبدالعزیز کا خیال یہ ہے کہ لوگ خوفزدہ ہوجاتے اور اسلام کی ترقی میں رکاوٹ ہوجاتی۔ جیسے ان کے تحت الشعور میں یہ بات ہے کہ جو گرد وپیش کے لوگ ہیں، ان میں ابھی خامی ہے۔ بہرحال وہ حقیقت ان کے ذہن میں ہے۔

میں کیا کروں کہ ان کا بیان ہے کہ پھر اسلام کی ترقی رک جاتی۔ یعنی بہت سے لوگ جو توقعات لئے بیٹھے ہیں، خوشگوار اُمیدوں میں ہیں، ان کو مایوسی ہوجاتی، اسلام کی ترقی رُک جاتی۔ حکمتِ ربانی اس کی متقاضی نہیں تھی کہ براہِ راست ان پر دشمن کا ظاہر بظاہر کوئی حربہ کارگر ہو۔ لیکن اگر یہ فضیلت فضائلِ رسولؐ میں شامل نہ ہوتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ کا درجہ دوسرے انبیاء سے گھٹ جاتا۔ لہٰذا منظور قدرت ہوا کہ براہِ راست تو حضرتؐ پر کسی کی تلوار کا وار نہ لگے، کسی کا نیزہ کام نہ کرے مگر یہ فضیلت آپؐ کے فضائل میں شامل بھی ہوجائے اس کیلئے خالق نے پیغمبرؐ خدا کو دونواسے عطا فرمائے اور شروع سے یہ اہتمام کیا کہ ان کی خصوصیت پیغمبرؐ خدا سے نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جائے۔ جو بھی شخص ہے، وہ اپنے باپ کی اولاد کہلائے گا، نسبت اسی کی طرف ہوگی۔ فرزند اپنے باپ کا ہوگا۔ یہ ہیں نواسے لیکن خدا نے ان کو اُن کا بیٹا قرار دیا۔ یہ ان کی خصوصیت رکھی کہ فرزند رسولؐ ہیں۔

اس کے علاوہ ہر ایک غذا شیر مادر سے ہوتی ہے لیکن انکی غذا رسولؐ کے لعاب دہن سے ہوئی تا کہ اجزائے جسم رسولؐ ان کے جسم میں شامل ہوجائیں۔

یہ اہتمام خالق نے کیا۔ میں کہتا ہوں کہ جب حضرتؐ نے یہ سب اس مقصد کی تکمیل کیلئے کیا تو ہم بھی جب مجالس کریں تو اسے بدعت نہ کہئے۔ یہ سب اہتمام ہوا اور اس کے بعد آخری بات یہ کہ شہادت کی دو اقسام ہیں: ایک شہادتِ سری اور ایک شہادتِ جہری۔ شہادتِ سرّی یعنی خفیہ شہادت۔ وہ زہر سے ہوتی ہے اور شہادت جہری یعنی کھلم کھلا۔ یہ شہادت تلوار سے ہوتی ہے۔ یہ دونوں اقسام کی شہادتیں دونوں نواسوں میں تقسیم ہوگئیں۔ شہادتِ سری حسنؑ مجتبٰی کے حصہ میں آئی اور تلوار والی شہادت حسینؑ کے حصہ میں آئی۔ اسی طرح فضیلت شہادت دونوں نواسوں کے ذریعہ سے فضائل رسولؐ میں شامل ہوگئی۔

یہ ان کی کتاب کا خلاصہ میں نے عرض کیا۔ اب نتیجہ نکالنا میرا کام ہے۔ خود تشریف فرما ہوتے تو ان کی کتاب کا خلاصہ ان کو سنا کر تصدیق کرواتا۔ اب آپ دیکھئے کہ جو نتیجہ نکل رہا ہے وہ صاف ہے یا نہیں ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ شہادتِ حسنؑ بھی شہادت رسولؐ ہے اور شہادت حسینؑ بھی شہادتِ رسولؐ ہے۔ بس اب بہت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ جب آپؐ نے یہ کہہ دیا تو اب اتنا بتا دیجئے کہ حسنؑ کا قاتل کس کا قاتل؟ اور حسینؑ کا قاتل کس کا قاتل؟ پھر اس قاتل کے بارے میں کچھ کہنے سننے میں اختلاف نہ رکھئے اور جو رسولؐ کے قاتل کو کہنا جائز ہو، وہ حسینؑ کے قاتل کو کہنا جائز سمجھئے اور جو رسولؐ کے قاتل کیلئے کہنا جائز ہو، وہی حسنؑ کے قاتل کیلئے کہنا جائز سمجھئے۔

ایک اعتراض جو مجالس پر ہوتا ہے اور تمام منطق وفلسفہ اور شریعت و قرآن وحدیث کے حربے صرف کئے جاتے ہیں۔ سوچ سوچ کر ہماری عزاداری پر اعتراض کئے جاتے ہیں۔ یعنی روتے ہم ہیں اور تکلیف دوسروں کی آنکھوں کو ہوتی ہیں۔ سینوں پر ماتم ہم کرتے ہیں اور درد دوسروں کے سینوں میں ہوتا ہے

اعتراض یہ ہے کہ تم وفاتِ رسولؐ کا غم اتنا کیوں نہیں کرتے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض اس وقت تک ہے جب کہو کہ وفاتِ رسولؐ اور شہادتِ حسینؑ۔ لیکن شاہ صاحب کے ارشاد کی روشنی میں سال میں دو تاریخیں ہیں: ایک وفاتِ رسولؐ کی، ایک شہادت رسولؐ کی۔ اب یہ آپ فیصلہ کیجئے کہ وفات کی یادگار منائیں یا شہادت کی۔ وفات کی یاد میں ہمارے لئے کوئی عملی نمونہ نہیں ہے مگر شہادت کی یاد میں جو اختیاری اقدامات ہیں، وہ ہمارے لئے نمونہ ہیں۔

تو اب بتایئے حیات اسلام کیلئے کون زیادہ مفید ہے؟ ہم سے کیا پوچھنا، اسی آسمان سے پوچھنا چاہئے کہ وفاتِ رسولؐ پر کیوں خون کی بارش نہیں ہوئی اور شہادتِ حسینؑ پر کیوں خون کی بارش ہوئی؟ اب اسے دیکھ لیجئے علامہ ابن حجر مکی کی کتاب صواعق محرقہ میں، جو ہماری رد میں نہایت سخت طریقہ سے لکھی گئی ہے، مطالب السئول میں دیکھ لیجئے، علامہ کمال الدین محمد ابن طلحہ شافعی اس کے منصف ہیں، تذکرہ خواص الامتہ علامہ سبط ابن جوزی کی تصنیف میں دیکھئے کہ شہادتِ حسینؑ پر چالیس دن تک جو کپڑا زیر آسمان پھیلایا جاتا تھا، اس پر خون کے نشان نظر آتے تھے۔ ہمارے شعراء مبالغہ کے طور پر کہتے ہیں ''خون کے آنسو''۔ حقیقت میں کائنات نے چالیس دن تک خون کے آنسو بہائے۔ اس کے معنی ہیں کہ عاشور کے دن ہی اس نے یومِ غم نہیں منایا بلکہ اربعین کی تاریخ بھی اس نے مقرر کر دی۔ بیس صفر تک چالیس دن پورے ہوتے ہیں جس میں کائنات سوگوار رہی ہے۔

کوئی کہے کہ راویوں نے بعد میں بیان کیا کہ خون کی بارش ہوئی مگر جناب! سب سے قدیم تاریخ کربلا کی طبری ہے، طبری نے بڑی تفصیل کے ساتھ واقعہ کربلا بیان کیا ہے۔

مصائب

یہ بعد کی بات نہیں ہے کہ بعد میں راویوں نے بیان کر دیا۔ بڑا دلدوز مرقع ہے جو یاد دلاؤں گا کہ وہ وقت جب کوفے کے بازار سے قافلہ گزر رہا تھا۔ گیارہ محرم کو قافلہ جب کربلا سے روانہ ہوا اور دوسرے تیسرے دن کوفہ پہنچ گیا یعنی بہت قریبی موقعہ، کوفہ کے بازار میں ایک جملہ سید سجاد علیہ السلام کا ہے، ایک جملہ مرثیہ کا ہے، منظر ایسا دردناک تھا کہ گزر رہا تھا قافلہ، چاروں طرف سے جو تماشائی آئے تھے، ان میں کہرام برپا تھا، مکانات کی چھتوں پر خواتین اور مردوں میں ایک گریہ کا عالم طاری تھا۔

اور میں کہتا ہوں کہ وہی دلیلِ انقلاب تھا۔ ایک جملہ فرمایا ہے ہمارے چوتھے امامؑ نے، ارے یہ سب رو رہے ہیں تو ہمارا قاتل کون ہے؟ اسی وقت حضرت زینب سلام اللہ علیہا، وہ جس نے کبھی کسی سے بات نہیں کی ہے، اس وقت انہوں نے مقصدِ حسینؑ کی تکمیل کیلئے اپنے خطبہ میں باپ کی یاد تازہ کر دی، سننے والے نے کہہ دیا اسی وقت کہ علیؑ کی زبان ہے اور زینبؑ بول رہی ہیں۔ اس خطبہ کو پیش نہیں کرنا ہے مگر یہ جملہ جو میرے بیان کی دلیل ہے کہ اس خطبہ میں ان دشمنوں کے مجمع میں جس میں ہر ایک انکار کرسکتا تھا، فاطمہؑ کی بیٹی نے اور اس وقت علیؑ کی نائب نے اور حسین علیہ السلام کے قافلے کی سالار نے یہ جملہ کہا:

"اَتَعۡجَبُوۡنَ اَنۡ تَبۡكِیَ السَّمَآءُ دَمًا"۔

"ارے تمہیں حیرت ہے کہ آسمان سے خون برس رہا ہے؟"

یہ طبری کے صفحات پر موجود ہے۔ یہ قطعی دستاویز ہے اس واقعہ کی صحت کی۔ کہا جاتا ہے کہ تم کیوں روتے ہو؟ (کئی صدیوں سے رو رہے ہو، آخر

کب تک روؤ گے؟) ارے جنہیں بروقت رونے کا حق تھا، انہیں رو لینے دیا ہوتا تو ہم نہ روتے۔ حسینؑ کے رونے والوں کی کمی نہ تھی، زینبؑ و اُمِ کلثومؑ جیسی بہنیں، فاطمہؑ وسکینہؑ جیسی بیٹیاں اور لیلیٰ و رباب جیسی ازواج، سیدِ سجاد علیہ السلام جیسا فرزند مگر رونے کہاں پائے؟ اِدھر وارث کی خبر آئی اور اُدھر اشقیاء آگ لے کر خیموں تک آ پہنچے۔

تیسری مجلس

ہوشیار تو لیتے نہیں کچھ اس سے سبق
بیہوش کو قرآن کی ہوا دیتے ہیں

(نجم آفندی)

- کسی نے جنابِ رسالت مآبؐ سے پوچھا کہ آپؐ نے علیؑ کا نام تو لیا ہی نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اس شخص کو دیکھو کہ کتنا عجیب ہے کہ میرے نفس کے متعلق مجھ سے پوچھ رہا ہے۔
- اب بلاغتِ پیغمبرؐ یہ ہے، علم معنی کتاب وہ ظاہری چیز ہے تو اس کیلئے ''شہر'' کہا ''اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ'' میں علم کا شہر ہوں اور حکمت جو اندرونی اسرار کا نام ہے، اس کیلئے گھر کہا کہ میں حکمت کا گھر ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر شہر میں داخل ہونا چاہتے ہو، تب بھی بغیر علیؑ کے نہیں آسکتے اور گھر میں جانا چاہتے ہو، تب بھی بغیر علیؑ کے نہیں آسکتے۔
- گویا رسولؐ یوں فرمارہے ہیں کہ ''ایہا الناس''، ابھی تک تو میں تھا اور قرآن، کل جب میں نہ ہوں تو پھر میرے اہل بیتؑ ہیں اور قرآن۔ اب بتایئے رسولؐ کی جگہ کون ہوا؟
- یہ خالق کا نظام اور اس کا ارادۂ خاص تھا کہ اب جس ہستی کو باقی رکھنا ہے، اُسے روزِ عاشور دن بھر غشی میں رکھا۔

جانشینیِ پیغمبر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ ٭ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۙ﴿۲﴾

وہ وہ ہے جس نے اُمِّیِّین میں پیغمبر بھیجا، انہی میں سے جو ان کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ بناتا ہے۔ کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

میں نے عرض کیا کہ اس آیت میں اور تین مرتبہ اس سے پہلے اللہ نے وہ کام بتائے ہیں جو اپنے پیغمبرؐ کے ذمہ رکھے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس آیت کے مضمون کو پیش نظر رکھئے تو جانشینی کا مسئلہ دشوار نہ رہے کیونکہ جانشینی کے معنی، جسمانی حیثیت سے جہاں کوئی رہتا ہو یا جس جگہ پر بیٹھتا ہو، اس مکان میں کوئی رہے اور اس جگہ پر کوئی بیٹھ جائے تو اس کے معنی جانشین کے ہیں۔ مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ دو حصوں میں بٹوارہ ہو جانے کی وجہ سے دونوں طرف کی آبادیوں میں داخل خارج ہو گیا۔ جو داخل تھے، وہ خارج

ہو گئے اور جو خارج تھے، وہ داخل ہو گئے۔

ایک مکان میں کوئی ڈاکٹر صاحب رہتے تھے، اب اس مکان میں ایک شاعر صاحب متمکن ہو گئے۔ تو یہ شاعر صاحب ڈاکٹر صاحب کے جانشین ہو گئے۔ جس کا دل چاہے، وہ جا کر دیکھ لے کہ ہیں اُسی جگہ پر۔ اگر جانشین کے معنی اس جگہ پر بیٹھنے والا ہو تو بالکل اسی جگہ پر یہ فروکش ہیں۔ ممکن ہے کہ انہی کی کرسی پر بیٹھتے ہوں۔ کبھی ایسا نہیں ہوگا کہ وہ سب مریض جو ڈاکٹر صاحب سے علاج کرواتے تھے، اب ان شاعر صاحب کے پاس آ جائیں کہ صاحب! آپ جانشین ہیں۔ تو ان مریضوں نے جگہ پر بیٹھ جانے کی وجہ سے شاعر کو ڈاکٹر کا جانشین نہیں سمجھا۔

فرض کیجئے وہاں پہلے عالم دین رہتے تھے۔ لوگ مسئلے پوچھنے آتے تھے۔ جب مکان خالی ہوا تو اس میں آ کر کوئی ڈاکٹر صاحب مقیم ہو گئے۔ تو جو لوگ دینی مسائل پوچھنے آتے تھے، اب وہ ان ڈاکٹر صاحب کو ان عالم دین کا جانشین نہیں سمجھیں گے، حالانکہ بیٹھے اسی جگہ پر ہیں۔ اب اس سے سمجھ میں آیا کہ یہ مکان والی جگہ جہاں جسم متمکن ہوتا ہے، یہ جانشینی کے معاملہ میں معتبر نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے اس فرد کی کہ وہ کام جو پہلا شخص انجام دیتا تھا، وہی کام یہ اس کی نیابت میں انجام دے۔ تب یہ اس کا جانشین ہوگا۔ چاہے جانشین ہوگا۔ چاہے جگہ بدل بھی جائے۔ مریض اس مکان کو جسمانی حیثیت نہیں دیکھیں گے، اس عمل اور اس کام کو دیکھیں گے جو وہ انجام دیتا ہے۔

میں نے مثال کے طور پر کہا ہے کہ ڈاکٹر کی جگہ اگر شاعر آ گئے۔ اب میں کہتا ہوں کہ پہلے وہاں ڈاکٹر رہتے تھے، اتفاق سے اب وہاں حکیم صاحب آ گئے تو یہ حکیم صاحب بھی ان ڈاکٹر صاحب کے جانشین نہیں سمجھے جائیں گے،

حالانکہ ایک ہی کام دونوں انجام دے رہے ہیں۔ مگر نہیں، جو اُن ڈاکٹر صاحب کے مریض تھے، وہ ان حکیم صاحب کے پاس نہیں آئیں گے۔ معلوم ہوا کہ فقط اتحادِ عمل ضروری نہیں ہے بلکہ طریق عمل کا اتحاد بھی ضروری ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی عالم دین کی جگہ کوئی بڑھئی آجائے۔ ڈاکٹر صاحب کی جگہ کوئی لوہار آ کر بیٹھ جائے۔ ظاہری طور پر بالکل جنس عمل الگ الگ ہو۔

ایسا بھی ہوسکتا ہے، چونکہ جگہ کسی کو نہیں نکالتی۔ اب اگر یہ ہے تو آیتِ نبوت جانشینی کے مسئلہ کو حل کرنے کیلئے کافی ہے۔ جس نے رسولؐ بنایا ہے، وہ ان کاموں کی فہرست پیش کررہا ہے۔ اسے دستاویز منصب سمجھنا چاہئے، منشورِ عہدہ سمجھنا چاہئے کہ اس نے عہدہ سپرد کیا ہے تو کاموں کی فہرست بھی بتادی ہے کہ یہ یہ کام ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ کام اپنی جگہ بہت اہم ہوں، ضروری ہوں مگر وہ کام اگر اس فہرست میں نہ ہوں تو وہ بحیثیت رسولؐ فرائض میں بنیادی حیثیت سے نہیں سمجھنے چاہئیں۔

مثال کے طور پر انتظام ملک بہت ضروری چیز ہے مگر میں کیا کروں کہ خدا نے رسولؐ کے کاموں میں اس کا اندراج نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ فتح ممالک بڑی اہم بات ہو مگر اس کا کیا کیا جاسکتا ہے کہ خدا نے رسالت کے کاموں میں فتح ممالک کا ذکر نہیں کیا۔ تو کوئی فاتح ممالک ہو، فاتح ہونے کی حیثیت سے بہت بڑا آدمی ہو مگر جب وہ یہ کام انجام نہ دے رہا ہو جو رسولؐ انجام دیتے تھے، تو کس طرح رسولؐ کا جانشین ہوجائے گا؟ اور ایک کام نہیں بلکہ بہت سے کام انجام دیتا ہو جو اپنی جگہ ممکن ہے کہ بہت دقیع ہوں لیکن وہ ان کاموں کی فہرست میں نہیں ہیں جو رسولؐ کے ذمہ ہیں تو ان کاموں کی وجہ سے وہ کسی فاتح کا جانشین ہوسکتا ہے، کسی منتظم ملک کا جانشین ہوسکتا ہے، لیکن رسولؐ کا جانشین نہیں ہوسکتا۔

اب اگر یہ کام جو پیغمبرؐ کے ذمہ ہیں، اگر پیغمبرؐ نے ان میں سے ہر ایک کام کسی کے سپرد کیا کہ یہ کام یہ انجام دے گا، یہ کام یہ انجام دے گا، چاہے وہ لفظ جانشین نہ بھی کہیں تو میں کہتا ہوں کہ ان کاموں کا سپرد کر دینا، یہی جانشین بنا دیتا ہے۔

اب اگر پیغمبرؐ نے ہر کام کیلئے نامزد کر دیا، مثلاً تلاوتِ کتاب جس کے معنی ہیں قرآن، ایک شخص کے سپرد کر دیا اور تزکیہ نفوس کا کام سپرد کر دیا۔ کتاب کی تعلیم کیلئے کسی کو مقرر کیا، حکمت کی تعلیم کیلئے بتا دیا کہ یہ شخص ہے جتنے کام رسولؐ کے ذمہ تھے، وہ تو رسولؐ نے سب دے دیئے۔ ارے بہت سوں کو دیتے تو بانٹ دیتے۔ ایک کو دیئے تو سب کام اس کے سپرد ہو گئے۔ تو ہر کام جو رسولؐ کے ذمہ تھا، وہ تو انہوں نے خود نامزد کر کے کسی کو دے دیا۔ اب کوئی پانچواں کام رہ گیا ہو تو دنیا اس کیلئے الیکشن کرے۔

تلاوت کا تعلق کتاب سے اور کتاب توریت، زبور اور انجیل تو نہیں، قرآن ہے۔ اسی کی تلاوت ہے متفق علیہ۔ اسناد دیکھ لیجئے کہ رسولؐ فرما رہے ہیں کہ:

"عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ مَعَ عَلِیٍّ"۔

''علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ''۔

کیا مطلب ہوا؟ یعنی انہیں چھوڑ کر قرآن نہیں ملے گا جسے کافی سمجھتے ہو، وہی بغیر ان کے نہیں ملے گا۔ معلوم ہوا کہ پہلا کام سپرد کر دیا۔ دوسرا کام تزکیہ نفوس۔ تزکیہ کا تعلق نفس سے ہے۔ جہاں تزکیہ کا لفظ ہے، اس کے ساتھ نفس آتا ہے۔ اسی لئے ترجمہ میں نفوس کا سدھارنا شامل کرتے ہیں۔ اب ذرا نفس کی حقیقت پر غور کیجئے۔ جتنے افعال ہیں، اعضا و جوارح کی نسبت سے فعل الگ ہے اور

فاعل الگ ہے، مثلاً اٹھانا ہاتھ کا کام ہے، پاؤں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سننا کان کا کام ہے، ہاتھ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ فعل الگ، فاعل الگ۔ لیکن جہاں نفس کی منزل آئی، سب کام ایک ہوگئے۔ سب کام ایک ہوگئے۔ راستہ طے کیا پیروں نے، آپ نے کہا میں نے طے کیا۔ دیکھا آنکھوں نے، آپ نے کہا میں نے دیکھا۔ کہا زبان نے، آپ نے کہا میں نے کہا۔ اٹھایا ہاتھ نے، آپ نے کہا میں نے اٹھایا۔

تو دیکھا آپ نے، اب یہ نہیں ہے کہ آنکھ نے دیکھا، میں نے نہیں دیکھا، ہاتھ نے اٹھایا، میں نے نہیں اٹھایا۔ نفس کی منزل میں وہ سب ایک کا ہوگیا۔ تو ایک تو نفس کی خصوصیت یہ ہے کہ اعضاء کی کثرت کو وہ وحدت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ جو کام کرنے والے بہت تھے، اب وہ سمٹ کر ایک میں جمع ہوگئے۔ یعنی وہ سب افعال ایک کے ہوگئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اعضاء سے جو کام ہوتا ہے، وہ کسی وقت خاص طور پر ہوتا ہے، اس سے پہلے وقوع میں نہیں آتا، مثلاً سائل آیا، آپ کے پاس جو کچھ تھا، وہ اٹھا کر دے دیا۔ تو یہ دینے کا کام اس وقت ہوا جب سائل آیا، یا مثلاً کسی مسئلہ کا جواب دینا اس وقت ہوگا جب کوئی مسئلہ دریافت کرنے آئے گا۔ اسی طرح دیکھنے کا کام اُسی وقت ہوگا جب کوئی منظر نظر کے سامنے ہوگا۔ پس افعال اس وقت ہوتے ہیں جب کسی خاص وقت پر اس کا سبب مہیا ہوتا ہے۔ لیکن وہ طاقت جو ان کاموں کو کرواتی ہے، جس کو ملکہ کہتے ہیں، وہ نفس میں قائم ہوتی ہے۔ دیا سائل کو اُس وقت جب سائل آیا مگر سخی اُس وقت بھی تھے جب سائل نہیں آیا تھا۔ اگر سخی نہیں ہوتے تو یہ کام ہوتا ہی نہیں۔ ایک کنجوس کے پاس بھی تو ہاتھ ہوتے ہیں۔ مگر ہاتھ میں وہ نفس کی طاقت نہیں ہے جو بروقت اس کام

کو انجام دلواتی ہے۔

شجاعت کا ملکہ نفس میں ہے۔ اثر اس کا ہاتھ سے نمایاں ہوتا ہے۔ جو علم کی مدد سے کسی مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے، وہ اس وقت پیش کرتا ہے جب کوئی پوچھنے والا آتا ہے۔ لیکن وہ علم جس سے جواب دیتا ہے، وہ پوچھنے والے کے آنے سے پہلے بھی موجود تھا۔ اگر علم نہ ہوتا تو پوچھنے والے کے آنے پر جواب نہ دے سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ اعضاء کے افعال سبب کے منتظر رہتے ہیں۔ لیکن نفس کے جو ملکات ہیں، وہ قائم رہتے ہیں، چاہے سبب وقوع میں آئے، چاہے نہ آئے۔ ملکہ نفس میں جو جو در ہتا ہے۔ وہی ہر وقت اس عمل کو کرواتا ہے۔

اب یہ دو خصوصیات آپ نے نفس کی سمجھ لیں۔ ایک کثرت سمٹ کر وحدت میں تبدیل ہوجاتی ہے، دوسرے نفس میں ملکہ ہوتا ہے۔ جو باعث ہوتا ہے افعال کے صدور کا۔ تو اب فرض کیجئے کہ سائل نہیں بھی آیا اور سائل آیا ہی نہیں عمر بھر تو عطا کا کام تو نہیں ہوا، لیکن سخاوت نفس میں موجود ہے۔ اگر سائل آتا تو ضرور دیتا۔ سخاوت نفس میں موجود ہے، چاہے بروئے کار آنے کا موقع ملے، چاہے نہ ملے۔ یعنی موقعہ کا ملنا یا نہ ملنا اتفاقِ روزگار سے تعلق رکھتا ہے اور ملکہ کا قیام نفس میں مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ چاہے سبب وقوع میں آئے، چاہے نہ آئے۔ اسی طرح سے اگر مسئلہ پوچھنے کوئی آیا ہی نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس دورِ میں بہت ہوگیا ہے کیونکہ لوگ علماء کا مصرف سمجھنے لگے استخارہ دکھوانا، جنازہ پڑھوانا، نکاح پڑھوانا۔ جو اصل کام ہے عالم کا یعنی مسائل کا حل کرنا۔ وہ اس دَور میں بحمداللہ سب ہی عالم ہوگئے ہیں۔ کسی کو مسئلہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی حالانکہ حدیث میں ہے تین چیزیں بروزِ قیامت فریاد کریں گی: ایک وہ قرآن جو کسی گھر میں رہا ہو اور اس کی تلاوت نہ ہوئی ہو۔ وہ قرآن بروزِ قیامت شکوہ

کرے گا، حالانکہ قرآن سے بہت سے کام لئے جاتے ہیں۔ جو مسافر جانے لگتا ہے تو قرآن کے نیچے سے گزار دیتے ہیں جیسے قرآن اس لئے اُترا تھا۔ کوئی بیمار ہو تو قرآن کی ہوا دیتے ہیں۔ کام لے لیا قرآن سے، ثبوت مل گیا کہ مسلمان ہیں۔ اب مجھے یہاں جناب نجم آفندیؒ کا شعر یاد آ گیا۔

ہوشیار تو لیتے نہیں کچھ اس سے سبق
بیہوش کو قرآں کی ہوا دیتے ہیں

تو یہ مصرفِ قرآن ہے۔ حدیث میں ہے کہ قرآن شکوہ کرے گا کہ اس گھر میں تھا، تلاوت نہیں ہوئی۔ وہ مسجد شکوہ کرے گی جو محلہ میں ہے اور مؤمنین اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں۔ مسجد خالی رہتی ہے۔ وہ عالم شکوہ کرے گا جو کسی شہر میں تھا اور لوگ اُسے دینی مسائل دریافت نہیں کرتے تھے۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ مجازی عالم ہیں جو اس وقت ہیں، حقیقی عالم جو تھے، اصل شکوہ ان کا ہوگا کہ زمانے نے ہم سے فائدہ نہ اٹھایا۔ تو یہ مسئلہ کوئی پوچھے نہ پوچھے، وہ ملکہ جس سے وہ جواب دیتا مسئلہ کا، اس کا انحصار پوچھنے والے کے آنے یا نہ آنے پر نہیں ہے۔ وہ نفس میں قائم رہتا ہے۔ لوگ نہیں پوچھتے، یہ ان کا قصور ہے، کہنے والا کہے گا ''سلونی''۔

اب اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر وہ طاقت بروئے کار نہیں آئی تو کام تو وجود میں نہیں آیا کیونکہ اس کا محرک نہیں تھا لیکن طاقت نفس میں موجود ہے۔ وہ ملکہ سببِ وقوع کا محتاج نہیں ہے۔ ملکہ سبب کا منتظر نہیں رہتا۔ وقوع میں آنا سبب کا منتظر رہتا ہے۔ اب خدا اور رسولؐ نے جس کو اپنا نفس کہہ دیا۔۔۔۔۔۔

کسی نے پیغمبرؐ خدا سے پوچھا کہ سب سے زیادہ آپ کو محبوب کون ہے؟ مردوں میں فلاں شخص، عورتوں میں فلاں۔ تو سننے والے کو آپ پر کافی تعجب

ہوا۔ آپؐ نے کہیں پر علیؑ کا نام نہیں لیا۔ اب وہ حدیث اسی نوعیت کی ہے کہ میرے نہ پڑھنے سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں اس کے تمام فقرات کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اب اس میں یہ جزو ہے تو اس کی کتنی قیمت ہے کہ اُس نے پوچھا کہ آپؐ نے علیؑ کا نام تو لیا ہی نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: اس شخص کو دیکھو کتنا عجیب ہے کہ میرے نفس کے متعلق مجھ سے پوچھ رہا ہے؟

اب تو یہ خیر حدیث تھی جس کی صحت کا ذمہ دار ہوں لیکن اگر کوئی صحیح نہیں مانتا تو چلو صحیح نہ سہی مگر قرآن کی آیت کا کوئی کیا کرے گا؟ پہلے قرآن مجید کی ایک ایسی آیت پڑھوں جو اتنے زیادہ سامعین کے ذہن میں نہیں ہوگی۔ ''قَاتِل''۔ اہل علم جانتے ہیں کہ جاہد کہنا چاہئے تھا کہ جہاد کیجئے۔ اور بڑی گنجائش تھی اس کی۔ اس لئے کہ رسولؐ کی پوری زندگی جہاد۔ جہاد کیلئے کوئی خاص شکل نہیں ہے۔ اپنی نفسانی خواہشات سے مقابلہ، وہ بھی جہاد بلکہ اُسے جہادِ اکبر کہا گیا ہے۔ کوئی قلم سے نصرتِ دین کر رہا ہے، وہ بھی جہاد۔ تو جہاد میں بڑی وسعت ہے۔ یعنی بنفس نفیس رسولؐ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمارہا ہے کہ ''قَاتِل''۔ اب قتال وہ نہیں ہے جو قلم سے ہوتا ہو، قتال کے معنی ہی ہیں قتل والا مقابلہ۔ وہ ہوتا ہی تلوار وغیرہ سے ہے۔ قتال میں وہ سب بحثیں نہیں آتی ہیں۔ تو ''قَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ'' اللہ کی راہ میں آپ قتال کیجئے۔

''لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ''۔

اور آپ پر یہ پابندی عائد کر رہے ہیں۔ آپ کے نفس پر۔ آپ پر جو ذمہ داری ہے، وہ اپنے نفس کی ہے۔ آپ مکلف نہیں ہیں، سوائے اپنے نفس کے۔ کوئی تشریح نہیں، صرف ترجمہ ہے کہ آپ مکلف نہیں ہیں سوائے اپنے نفس کے۔

ہاں! دوسرے اہل ایمان کو آپ ترغیب دیتے رہئے کہ جنگ کریں۔ لیکن ان کے عمل کے آپ ذمہ دار نہیں ہیں۔ آپ پر پابندی اپنے نفس کی ہے۔ اب میں دیائے تاریخ کو دعوت دوں گا کہ وہ آئے غزوات اسلامی میں اور بتائے کہ پیغمبرؐ نے جہاد کہاں کیا؟ بنفس نفیس۔ بدر میں جہاد کیا؟ اُحد میں، خندق میں، خیبر میں، کہیں؟ دنیا بتائے کہ پیغمبرؐ نے بذاتِ خود جہاد کہاں کیا؟

اب میں تمام دنیا کو دعوت دوں گا کہ وہ ہمت کر کے یہ کہے کہ پیغمبرؐ نے حکمِ خدا پر عمل نہیں کیا یا اگر جرأت ہو تو ان الفاظ کو قرآن سے قلم زد کرے۔ قرآن سے نکالے۔ اب میں کہتا ہوں، پرانے زمانہ میں کسی نے ہمت کی ہے۔ اب تو کسی مسلمان میں ہمت نہیں ہے۔ کوئی چارۂ کار سوائے اس کے نہیں ہے کہ یا تو پیغمبرؐ خدا کی شان میں یہ گستاخی کرے کہ انہوں نے (معاذ اللہ) حکمِ الٰہی کو نا قابل عمل سمجھا یا قرآن میں سے ان الفاظ کو نکالے کہ یہ الفاظ قرآن میں ہیں ہی نہیں۔ یا پھر کوئی چارۂ کار نہیں کہ جو ہر میدان میں لڑتا ہوا نظر آئے، اسے رسولؐ کا نفس مان لے۔

دوسری آیت جانی پہچانی ہوئی آیۂ مباہلہ۔

نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ قف

اب الفاظ قرآن کے یہی اور جو افراد رسولؐ اپنے ساتھ لائے ہیں، وہی وہی جو بحمد للہ آپ کو معلوم ہیں۔ یعنی اپنے پورے مطالعہ کی پشت پناہی پر میں عرض کر رہا ہوں کہ جتنی آیتیں قرآن مجید میں ہیں جو ہمیں معلوم ہیں کہ آپ کی شان میں اور اہل بیتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہیں، تقریباً ہر جگہ مفسرین نے

کوئی اور قول نقل کر دیا ہے، کوئی اور نام لے دیا ہے۔ چاہے اُس نام سے کوئی دلچسپی نہ ہو، مگر یہ کیا کم ہے کہ یہ نہ رہے، کوئی اور ہو جائے، یہ منزلِ مباہلہ ہے کہ یہاں کسی کی مجال نہیں کہ کوئی اور نام پیش کرے۔

تو جس طرح الفاظِ قرآنی معین، اسی طرح وہ افراد جنہیں پیغمبرؐ خدا اپنے ساتھ لائے، وہ بھی معین۔ اس میں بھی کوئی ضعیف سے ضعیف قول کسی دوسری شخصیت کے بارے میں نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خالق کا یہ انتظام تھا، اس لئے کہ خود قرآن سے تمہاری سمجھ میں آ جائے، چاہے کہیں کافی نہ ہو، یہاں کافی ہو جائے۔ جس ترتیب سے پیغمبرؐ خدا کے ساتھ افراد ہیں، اسی ترتیب سے الفاظِ قرآنی۔

اب ایک ہی بات ہے، چاہے دنیا سمجھے کہ رسولؐ کا ارادتاً یہ عمل تھا کہ جس ترتیب سے الفاظِ قرآن ہوں، اسی ترتیب سے میں افراد کو لے جاؤں یا رسولؐ کے علم غیب میں علماء کو اختلاف ہو تو ہوا کرے۔ اللہ سبحانہ کے علم غیب میں کوئی اختلاف نہیں ہے تو میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ اللہ کو معلوم تھا کہ رسولؐ کس ترتیب سے افرادِ مباہلہ کو لائیں گے۔ وہ جس ترتیب سے لانے والے تھے، اُسی ترتیب سے اللہ نے الفاظ اتارے تاکہ جس لفظ کے معنی نہ سمجھو، رسول کے ساتھ کے فرد کو دیکھ لو۔

ایک صفت ہے فن بدیع کی لف ونشر مرتب۔ یعنی لف ونشر ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں، ایک مرتب اور دوسری غیر مرتب۔ تو لف ونشر کیا ہے کہ چند چیزیں ایک ساتھ بیان ہوں اور جو اُن کے متعلق چیز ہو، وہ ایک ساتھ بیان ہو۔ اگر سلسلہ وہی ہے ترتیب کے ساتھ، تو وہ لف ونشر مرتب ہے اور اگر ترتیب بدل گئی ہے تو لف ونشر غیر مرتب۔ مگر وہ ایک ہی متکلم کے کلام میں ہوتا ہے۔ لف وہ چند

چیزیں جو پہلے بیان کی گئیں اور بعد میں جو ان کے متعلق آتے ہیں، وہ نشر کہلاتے ہیں تو لف ونشر ایک ہی کلام میں ہوتا ہے مگر یہاں خدا و رسولؐ میں ایسی وحدت ہے کہ اللہ کے کلام میں لف ہے اور رسولؐ کے کلام میں نشر ہے۔ یعنی وہی ترتیب اور وہ دونوں مل کر لف ونشر مرتب ہوئے۔

اسی سلسلہ میں اللہ کے کلام کے الفاظ، اسی سلسلہ سے رسولؐ کے ساتھ افراد۔ وہاں سب سے پہلے ''اَبْنَآءَنَا'' ہے تو یہاں سب سے پہلے حسنؑ و حسینؑ رسولؐ کے ساتھ آگے آگے ہیں۔ وہاں اس کے بعد ہے ''نِسَآءَنَا''، یہاں حضرت خاتونِ جنت فاطمہؑ کے عقب میں ہیں۔ وہاں سب سے آخر میں ہے ''اَنْفُسَنَا'' تو یہاں لڑائیوں میں جو سب سے آگے ہوتا تھا، وہ یہاں سب سے پیچھے۔ وہاں ''اَنْفُسَنَا'' سب سے آخر میں ہے تو یہاں سب سے عقب میں حضرت امیرالمومنینؑ سب سے آخر میں ہیں۔ افراد تو بدل نہیں سکتے تھے، نہ الفاظ تبدیل کئے جا سکتے تھے۔ قرآن کے الفاظ بھی معین، رسولؐ کے ساتھ کے افراد بھی معین۔

وہ علماء جن کو ایسی آیتوں میں زورِ علم صرف کرنے سے دلچسپی ہے، تو اب وہ ''ابناءنا'' کا کیا کریں؟ ہم اپنے بیٹوں کو لائیں۔ تو اب وہ ان میں سے کسی کو بیٹا بنائیں تو وہاں علم کا بس کچھ نہیں چلا۔ اس کے بعد ''نسائنا''۔ اب یہ عورت کسے بنا دیں؟ وہاں بھی کچھ امکان نہیں ہے تو پوری طاقت علم کی ''اَنْفُسَنَا'' پر صرف ہو گئی۔ اب زورِ علم نے کیا کام دکھایا کہ کہا کہ: ارے خود رسولؐ بھی تو ہیں۔ اب اور تلاش کی کیا ضرورت ہے؟ بس رسولؐ خود۔ گویا فیصلہ ہو گیا۔ مطلب نکل آیا۔ مگر پہلے عربی دان طبقہ تو کیا، اُردو دان طبقہ فیصلہ کر دے کہ کہا جا رہا ہے ہم بلائیں۔ تو کیا آدمی خود اپنے کو بلاتا ہے؟ اور بلاتا بھی تو سب

سے آخر میں۔ پہلے بیٹوں کو بلائے، پھر نسائنا کو بلائے، پھر بیچارہ اپنے کو بلائے۔ تو کلامِ الٰہی کی منزل سے ہٹ کر کہاں پہنچ جائے گا اپنی خودغرضیوں کی وجہ سے؟

پھر اس کے بعد ایک سوال ان لوگوں سے کہ میں نے کہا کہ شخصیات تو مقرر ہیں، ان میں نہ تو کوئی بڑھایا جا سکتا ہے، نہ گھٹایا جا سکتا ہے۔ اب آپ نے الفاظ کا بٹوارہ کر دیا۔ اَبْنَاۤءَنَا ہو گئے مجبوراً حسنؑ و حسینؑ۔ اس میں آپ کچھ نہیں کر سکے۔ نساۤءَنَا ہو گئیں حضرت فاطمہؑ۔ اس میں آپ کا کوئی بس نہیں چلا۔ اب اَنْفُسَنَا کو آپ نے کہہ دیا خود رسولؐ اللہ۔ تو میرا بس ایک سوال ہے کہ پھر علیؑ کس لفظ کی بناء پر آئے ہیں؟

تو بہرحال یہ حقیقت شبہ سے بالاتر ہے کہ اَنْفُسَنَا سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔ اب وہ دو آیات ہو گئیں اور حدیث بھی ہو گئی۔ تو ان سب سے پتہ چلا کہ ان کو نفس کہا۔ نفس کی خصوصیات عرض کی تھیں۔ تو انہیں دیکھئے۔ جب تک اپنا ہاتھ کہا، ہاتھ کے کام اپنے بنے۔ جب تک اپنی زبان کہا، اس وقت تک اقوال اپنے بنے۔ جب تک اپنا کان کہا، اس وقت سامع اپنا بنا۔ جب تک اپنی آنکھ کہا، نگاہ اپنی بنی لیکن جب نفس کہہ دیا تو جتنے افعال ان کے ہیں، جتنے اقوال ان کے ہیں، وہ سب اقوال و افعال خدا و رسولؐ کے اقوال و افعال ہو گئے۔ ان کا ہر کام اب اللہ کا کام ہو گیا۔ اب اسی ایک حدیث کے اور مفہوم اسی پر مبنی ہیں۔ وہ متفق علیہ حدیث ایسی کہ وہ صحاحِ ستہ اور صحاحِ ستہ میں سب سے مستند صحیح بخاری اور اس میں موجود کہ:

"يَا عَلِيُّ حَرْبُكَ حَرْبِيْ سِلْمُكَ سِلْمِيْ"

اب لفظی ترجمہ پہلے کر دوں کوئی چارۂ کار اس کے سوا نہیں ہے کہ یا علیؑ!

تمہاری جنگ میری جنگ ۔ اور وہ ترجمہ غلط ہے، تمہاری صلح، تمہارا عدم جنگ میرا عدم جنگ ۔ اب میں نے کہا مجبوراً یہاں لفظی ترجمہ کرنا پڑا ۔ تشریح نہیں ہوسکتی کیونکہ حرب وسلم دونوں ہیں ۔ مصدر اور مصدر کی اضافت کبھی فاعل کی طرف ہوتی ہے، کبھی مفعول کی طرف ۔ اس کی ہمارے ہاں بھی مثال ہے، مثلاً مارنا مصدر اور مار حاصل مصدر ۔ ہمارے ہاں اس کے دو استعمال ہیں ۔ فرض کیجئے کہ آپ اپنے دوست کے ہاں گئے، وہ اپنے بچے کو مار رہے تھے اور ایسی بیدردی سے مار رہے تھے کہ آپ سے رُکا نہیں گیا ۔ آپ فوراً صاحب سلامت کر کے واپس چلے آئے ۔ دوسرے دن وہ ملے، انہوں نے کہا کہ بھئی آپ آئے اور فوراً واپس چلے گئے، ٹھہرے بھی نہیں ۔ آپ نے کہا کہ تمہاری مار سے مجھے ایسی اذیت ہوئی کہ مجھ سے ٹھہرا نہیں گیا ۔ کیا مطلب؟ تمہاری مار سے یعنی تم جو مار رہے تھے، تو یہ اضافت ہے فاعل کی طرف، مارنے والے کی طرف ۔

اگر خدانخواستہ دوست نہیں، آپ کے کوئی شناسا ۔ راستہ میں کسی نے انہیں زدوکوب کیا، آپ نے سنا تو بہت افسوس ہوا ۔ وہ آپ سے ملے تو آپ نے کہا کہ تمہاری مار کا واقعہ میں نے سنا، بڑی تکلیف ہوئی ۔ اب یہ تمہاری مار کے معنی کیا ہیں؟ یعنی تم پر جو مار پڑی ۔ وہ اضافت فاعل کے جملوں کی ۔ اب رسولؐ کے الفاظ کیا ہیں؟ ''حربك'' تمہاری جنگ ۔ اور جنگ مصدر ہے ۔ تو دو ہی صورتیں ہیں، یا اضافت فاعل کی طرف یا مفعول کی طرف ہے ۔ اب فاعل کی طرف اضافت ہے یہ معنی ہوں گے کہ یا علیؑ! تمہاری جنگ یعنی جس جس سے تم جنگ کرو تو ایسا ہے جیسے میں نے جنگ کی ۔ جس جس سے جنگ کرو، اُسے دنیا منظور کرے ۔ یا اضافت مفعول کی طرف ہوگی تو معنی ہوں گے کہ جو جو تم سے جنگ کرے، وہ ایسا ہے جیسے مجھ سے جنگ کی ۔ یا اُسے پسند کر دیا، اسے پسند کرو ۔

ایک اصول پر قائم ہو جاؤ۔ پھر شخصیات نہ دیکھنا کہ کون کون لڑ رہا ہے۔ رسولؐ نے کوئی نئی حدیث نہیں فرمائی۔ حقیقت میں بالکل وہی ہے جو اس قرآن مجید کی آیت کا تقاضا ہے۔ قرآن مجید کی آیت کے معنی بنتے ہی نہیں جب تک یہ نہ سمجھیں کہ ان کی جنگ رسولؐ کی جنگ۔ جبھی تو اس نے کہا تھا کہ تم خود جنگ کرو۔ تمہارے نفس کو تکلیف دی جاتی ہے اور اب علیؑ نے جنگ کی ہر جگہ۔ تو ماننا پڑے گا کہ یہ نفس رسولؐ ہیں کہ ان کے جنگ کرنے سے رسولؐ کو سبکدوشی ہوئی یعنی فریضہ الٰہی جو رسولؐ کا تھا، اس کی تکمیل ان کے ہاتھ سے ہوئی۔ تو وہی تو ہوا کہ ان کی جنگ رسولؐ کی جنگ۔ وہی رسولؐ فرما رہے ہیں کہ تمہاری جنگ میری جنگ۔ بس اس کی قید نہیں ہے کہ میری زندگی میں یا میرے بعد۔

اب وہ خصوصیت جو نفس کی تھی کہ میں نے کہا کہ اعضاء کی منزل میں افعال الگ الگ ہوتے ہیں اور نفس کی منزل میں وہ سب سمٹ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جب ان کو اپنا نفس کہہ دیا تو ہر بات جو ان کی ہو، وہ رسولؐ کی بات ہے۔ کام ان کا رسولؐ کا عمل۔ تو یہ نتیجہ نفس ہونے کا اور اس کے بعد اب دوسری چیز، وہ یہ ہے کہ ہاتھ اور اعضاء سے جو کام ہوں، وہ سب کے سب منتظر ہوتے ہیں اور نفس کی جو طاقت ہو، وہ قائم رہتی ہے۔ تو اب اگر زبان کہا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو جو تم نے کہا، وہ میرا قول ہے۔ جب تک اپنی آنکھ کہا تو اس کا مطلب ہے کہ جو تمہاری آنکھ نے دیکھا، وہ میری آنکھ نے دیکھا۔ اسی طرح ہر کام۔ لیکن جب نفس کہہ دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو جو کام میں نے نہ بھی کئے ہوں اور تم انجام دو تو تم میرے نفس ہو۔ تو وہ تمہارے سب کام جو نہیں بھی ہوئے، خواہ تم نے نہیں کئے یا میں نے نہیں کئے، نہ ان میں عمل میں لانے کی شرط، وہ سب میرے ہیں اور ملکے راسخ ہوتے ہیں، منتظر سب نہیں ہوتے۔ یعنی شجاعت یہی

نہیں ہے کہ میدان میں تلوار اٹھائیں، تب شجاع۔ جی نہیں۔ جو شجاعت خیبر میں ہے، وہی پچیس برس کی خاموشی میں ہے۔ اس وقت قتل کر رہے تھے، وہ کام اب نہیں ہو رہا کہ قتل کریں کسی مفادِ اسلامی سے لیکن شجاعت میں فرق نہیں ہے۔ کوئی حیرت سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسے شجاع ہیں تو خاموش کیوں ہیں؟ شجاعت عمل کا نام نہیں ہے۔ شجاعت نفس کی طاقت کا نام ہے۔ عمل میں آنا بہ اعتبارِ مصالح ہوتا ہے اور ملکہ نفس کی طاقت ہوتی ہے جو نفس میں راسخ ہوتی ہے۔

تو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ملکات منتظر سبب نہیں ہوتے۔ چاہے کوئی سوال کرے یا نہ کرے، علم ہے۔ چاہے لڑنے کا موقع ملے یا نہ ملے، لڑنا مناسب ہو یا نامناسب۔ شجاعت جس کا نام ہے، وہ نفس میں راسخ ہے۔ اب اسکے بعد ایک اور نتیجہ نکلا کہ جب تک کہا تھا زبان اور ہاتھ، تو وقوع میں آئی ہوئی باتیں سب رسولؐ کی ہوئیں۔ اب جن شخصیات کو نفس کہہ دیا ہو، تو ملکات نفس رسولؐ میں آ گئے۔ یعنی اب ان میں یہ ہی نہیں دیکھنا کہ رسولؐ نے کیا کیا؟ اب ہم ان کے عمل سے دیکھ سکتے ہیں کہ رسولؐ ہوتے تو کیا کرتے؟

اب 50ھ میں جو صلح کرے تو سمجھ لیجئے کہ رسولؐ ہوتے تو صلح کر لیتے۔ 61ھ میں جو تلوار لے کر کھڑا ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ رسولؐ ہوتے تو تلوار لے کر کھڑے ہو جاتے۔ افعال تو بتقاضائے مصالح واسباب ہوتے ہیں۔ نفس کا ملکہ ہر حال میں ایک رہتا ہے۔ اب جسے نفس بنایا، تو تزکیہ نفس کا تعلق نفس سے ہے اور کوئی صفت دوسرے میں نہیں پہنچائی جا سکتی، جب تک خود اپنے میں نہ ہو۔

کل یہ عرض کیا ہے کہ نفوس کے تزکیہ کا ان سے متعلق کرنا بھی ایک طرح کی آیۂ تطہیر ہے۔ یعنی ان کا نفس اتنا پاکیزہ ہے کہ یہ دوسروں کو اس پاکیزگی کا فیض پہنچا سکتے ہیں اور دوسروں کے نفوس کو پاک کرنا ان کے ذمہ ہے۔ تو اب

جسے رسولؐ نے اپنا نفس کہہ دیا ہو، تو ماننا پڑے گا کہ جو پاکیزگی پیغمبرؐ کے نفس میں تھی، وہی پاکیزگی اب اس نفس میں ہے۔ تو اب تزکیہ نفوس کا کام جو پیغمبرؐ انجام دے رہے تھے، وہ نفس کہنے سے ان سے متعلق ہو گیا۔ چونکہ یہ نفس رسولؐ ہیں اور تزکیہ کا تعلق نفوس سے ہوتا ہے، لہٰذا اب یہی نفس وہ ہوسکتا ہے جو رسولؐ کی جانب سے تزکیہ نفوس کا ذمہ دار ہو۔

اس کے بعد ''يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ''، میں نے کہا تھا کہ یہ ہے تو ایک جملہ لیکن دراصل دو کام ہیں۔ ایک کتاب کی تعلیم اور ایک حکمت کی تعلیم اب میرے پیش نظر دو احادیث ہیں اور دونوں متفق علیہ۔ پہلی حدیث تو بہت معروف ہے کہ جس نے علم الکتاب کا ان کو مرکز بنایا تھا۔ تو رسولؐ نے فرمایا کہ:

''اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا''۔

''میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اُس کا دروازہ ہیں''۔

اور تتمہ یہ ہے کہ:

''مَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْيَأْتِ مِنْ بَابِهَا''۔

جو علم چاہے، وہ دروازہ پر آئے یعنی اسے چھوڑ کر علم الکتاب نہیں ملے گا۔ تو یہ حدیث تو بہت مشہور ومعروف وہ چوتھا جزو جو تھا حکمت کی تعلیم کا، اس کے لئے پیغمبرؐ خدا نے ارشاد فرمایا:

''اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا''۔

''میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں''۔

کیا کہنا بلاغتِ رسولؐ کا! خود فرمایا ہے کہ جن لوگوں نے ضاد کے حرف کے ساتھ کلام کیا ہے، ان میں فصیح ترین میں ہوں۔ ضاد کا تلفظ عرب سے مخصوص ہے۔ تو یہ افصح العرب ہیں، انکا ارشاد ہے۔ اب ہر ایک غور کرے کہ کیا بلاغت اس میں مضمر ہے۔ ظاہری مفہوم جو ہو، وہ معنی ہوتے ہیں۔ حکمت میں نے عرض کیا اسرار و رموزِ کتاب ہیں، وہ تہہ کے اندر ہیں۔ شہر بیرونی چیز ہے اور گھر اندرونی چیز ہے۔ یعنی جو شہر تک پہنچ گیا ہے، ضروری نہیں ہے کہ وہ گھر تک پہنچ گیا ہے۔ مگر جو گھر تک پہنچا تو شہر میں پہلے پہنچ چکا ہے۔ اگر شہر میں نہ پہنچتا تو گھر تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب بلاغتِ پیغمبرؐ یہ ہے کہ علم معنی کتاب، وہ ظاہری چیز ہے تو اس کیلئے شہر کہا: "اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا"، میں علم کا شہر ہوں۔ اور حکمت جو اندرونی اسرار کا نام ہے، اس کیلئے گھر کہا کہ میں حکمت کا گھر ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر شہر میں داخل ہونا چاہتے ہو تب بھی بغیر علیؑ کے نہیں آ سکتے اور گھر میں جانا چاہتے ہو، تب بھی بغیر علیؑ کے نہیں آ سکتے۔

تو جو جو کام رسولؐ کے ذمہ تھے، وہ آپؐ نے ایک فرد کے سپرد کر دیئے۔ قرآن اس کے سپرد کیا، تزکیہ نفوس اس کے سپرد کیا، علم الکتاب اس کے سپرد کیا۔ علم الحکمت اس کے سپرد کیا۔ اب کوئی پانچواں کام آپ بتایئے، اس کی وجہ سے جانشین سمجھ لیں۔

اب میں نے حقیقت میں جتنی احادیث پیش کیں، وہ ہیں تو ایک ذات کے بارے میں لیکن دراصل ایک ذات کے ذریعہ سے رسولؐ ایک پورے نظام کی زمامِ کار علیؑ کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں کہ بس جو فکر و نظر کے چورا ہے ہوں، جانشینی کے باب میں، اس میں بس علیؑ تک پہنچ جاؤ تو سب تک پہنچ جاؤ تو سب پہنچ جاؤ گے۔ اس لئے پورے سلسلہ کیلئے بھی ایک حدیث ارشاد فرمائی جو اس حقیقت

کی مظہر ہے، وہ متفق علیہ حدیث:

''اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلَبَیْتِیْ مَااِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْ بَعْدِیْ''۔

میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا تا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت جو میرے اہل بیتؑ ہیں۔ جب تک ان دونوں سے تمسک رکھو گے، کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے، قیامت تک کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ ہر صاحبِ فکر غور کرے، ہر صاحبِ فہم سوچے کہ پیغمبرؐ نے یہ اعلان جو فرمایا ہے۔ میں کہوں گا کہ یہ میں بھی مانتا ہوں کہ یہ دو چیزوں کا اعلان ہے مگر یہ اصل اعلان کس چیز کا ہے؟ دو چیزوں میں سے ایک تو کتاب اللہ ہے یعنی قرآن۔

میں کہتا ہوں کہ کیا یہ قرآن رسولؐ کی زندگی میں واجب العمل نہیں ہے؟ وہ اسے بعد کے لئے کہاں چھوڑ رہے ہیں؟ وہ تو اس وقت بھی ہے مگر اس وقت قرآن کے ساتھ خود رسولؐ ہیں۔ یعنی اس وقت بھی دو چیزیں ہیں۔ ایک قرآن اور ایک خود رسولؐ۔ اب قرآن دنیا سے نہیں اٹھ رہا ہے مگر پیغمبرؐ اپنی ظاہری زندگی کے ساتھ، اپنی حیاتِ عنصری کے ساتھ دنیا سے تشریف لے جا رہے ہیں۔

تو اب پیغمبرؐ نے جو اعلان کیا ہے، وہ قرآن کا کیا اعلان ہے؟ اب قرآن کے ساتھ جس کیلئے کہا ہے، اصل اعلان اس کیلئے ہے۔ گویا رسولؐ یوں فرما رہے ہیں کہ ''اَیُّهَا النَّاسُ''، ابھی تک تو میں تھا اور قرآن۔ کل جب میں نہ ہوں تو پھر میرے اہل بیتؑ ہیں اور قرآن۔ اب بتائیے رسولؐ کی جگہ پر کون ہوا؟ قرآن کا ساتھی بدل رہا ہے۔ گویا رسولؐ فرما رہے ہیں کہ جیسے اس

وقت قرآن اکیلا نہیں ہے، اس کے ساتھ میں ہوں۔ اسی طرح میرے بعد بھی قرآن کو اکیلا نہ سمجھنا۔ میرے اہل بیتؑ قرآن کے ساتھ ہوں گے۔ اب دنیا نے سمجھ لیا کہ ان دو کو چھوڑا ہے اور ذمہ داری لی ہے قیامت تک کی۔ اس لئے جیسے دنیا کو کد ہو گئی کہ اس دوسرے کو ہم رہنے ہی نہیں دیں گے۔ آپؐ نے کہا کہ یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے، جب تک یہ ہے، وہ بھی رہے گا۔ رہنے دینا یا نہ دینا ہمارا کام ہے۔ ہم رہنے ہی نہیں دیں گے۔ اس لئے جو آیا، اُسے راہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔ دنیا کہتی ہے کہ ہم نے کسی کو اتنی مدت زندہ رہتے نہیں دیکھا۔

میں کہتا ہوں کہ آپ نے کیا، میں نے بھی نہیں دیکھا مگر مجھے دنیا سے مطلب نہیں، جس سلسلہ میں میری گفتگو ہے، اسی سلسلہ کے کسی فرد کو میں نے مرتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ خارجی حملوں نے کام کیا۔ زہر یا تلوار، کسی ایک کو بھی تو میں نے ان میں سے اپنی موت سے دنیا سے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ دنیا کو کد ہے کہ ہم نہیں رہنے دیں گے۔ گویا واجب اور ممکن میں مقابل ہے۔ واجب کی طرف سے ضمانت کہ یہ رہیں گے۔ رسولؐ اسی کے ترجمان تو ہیں اور ممکن بندوں کی یہ کوشش کہ ہم رہنے نہیں دیں گے۔ تو جب تک اس کے مقصد کا انحصار نہ ہو جائے، وہ حربوں کو کارگر ہونے کب دے گا؟ اسے نہیں رہنے دیا، ابھی میرے پاس اور ہے۔ اسے نہیں رہنے دیا، ابھی ہمارے پاس اور ہے، اس لئے کہ اور ہے، اس میں سن وسال کی قید نہیں۔ جب گہوارکا بچہ یہ اعلان کر سکتا ہے کہ میں نبی ہوں تو دین کا کوئی رہنما!

مصائب

اس کیلئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ لیکن جب اللہ کے مقرر کردہ نظام بقاوفنا کا انحصار کسی ایک فرد کی فنا و بقا پر ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی بقا وفنا

میں خدا کی فتح وشکست کا سوال ہے کہ اگر یہ ہے تو خدا کی بات پوری ہوئی اور اگر یہ نہ رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا (معاذ اللہ) شکست کھا گیا۔ جب ایسا موقع ہو گیا تو پھر اللہ نے اپنے انتظام سے اس کی حفاظت کی۔ اب اس کی طرف سے مقرر کردہ نظام میں جو فرد یہاں پر ہے، اس فرد کی حفاظت کرنے کا وہ ذمہ دار ہے۔ لہٰذا پوری طاقت صرف ہوگئی تھی کربلا میں کہ کربلا میں وہ نظام درہم برہم کر دیا جائے لیکن خدا کو جسے رکھنا تھا، اُس کیلئے حفاظت کا سامان اپنی طرف سے کیا۔

میرا ایمان ہے کہ مرض کی مجال نہیں تھی کہ کبھی ان ہستیوں کو بے ہوش کر سکے۔ یہ خالق کا نظام اور اُس کا ارادۂ خاص تھا کہ اب جس ہستی کو باقی رکھا ہے، اسے دن بھر غشی میں رکھا۔ یہ عالمِ صحت کے عالم میں ہوں اور نصرتِ امامؑ نہ کریں، یہ انؑ کے کردار کی بلندی کے خلاف ہے۔ پھر انؑ کا معیارِ عصمت ختم ہو جاتا اور اگر یہ باقی نہ رہی تو خالق کی طرف کا مقرر کردہ نظام، جو جس جگہ کی کڑی ہے، وہ کڑی اُسی جگہ پر رہے۔ تب اس کا نظام محفوظ ہو۔ صادق کی بات ہے کہ بارہ ہوں گے۔ اب اگر پانچواں دو چار برس کا ہے بھی، تو اس پانچویں کے ہونے سے جو اس سلسلہ کا مقصد ہے، وہ پورا نہیں ہوگا۔ اس جگہ جو کڑی ہے، اس کو رہنا چاہیئے ورنہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نظام درہم برہم ہو گیا۔ صادق کی خبر غلط ہو گئی۔ بارہ کی بجائے گیارہ ہو گئے۔ لہٰذا اسے اس فرد کو رکھنا ہے، جسے صاحبِ منصب بنایا ہے۔

❁❁❁❁❁